جلد 6 شمارہ 1

جنوری تا اپریل 2013

چیلنج

ایڈیٹرز: عذرا طلعت سعید/صبیحہ حسن

... کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

گلوبلائزیشن کی اصطلاح اکثر نوآبادیات سے جوڑی جاتی ہے کیونکہ گلوبلائزیشن اور نوآبادیات میں سامراجی قوتوں کی استحصالی پالیسی یکساں سمجھی جاتی ہے۔ پاک و ہند کی سرزمین برطانوی راج کے کئی مظالم کی آج بھی گواہ ہے۔ یورپ میں مرکنٹل ازم دور نے جو کہ برآمدات کے ذریعہ قومی خزانوں کو مالا مال کرنے پر زور دیتا تھا افریقہ، لاطینی امریکہ اور ایشیاء کے برآعظموں کی تاریخ کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ نوآبادیات کی وحشیانہ پالیسیوں نے خاص طور پر برصغیر کی صنعت و زراعت پر گہرے منفی اثرات چھوڑے۔ آج 60-50 سال کی مدت کے بعد جبکہ ''تہذیب یافتہ'' سرمایہ دار ممالک کے اعلیٰ تدریسی ادارے تسلیم کرتے ہیں کہ نوآبادیات کا دور ان کی تاریخ پر کالا دھبہ ہے، ایک بار پھر سے یہ ممالک ''جدید'' نوآبادیات کو تیسری دنیا کے ممالک پر مسلط کررہے ہیں جو کہ گلوبلائزیشن کہلاتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ سامراجی استحصالی اداروں نے لے لی ہے۔ جن میں سرفہرست ڈبلیو ٹی او، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اب یہ ہماری سرزمین پر ''حاکم'' نہیں بلکہ ''معاون دوست'' اور ''مددگار'' کا بہروپ لیے ہوئے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ سامراج کا ساتھ دینے کے لیے ہماری اشرافیہ ہر وقت تیار ہے۔ ہمارے ملک کی اعلیٰ افسرشاہی، جاگیردار تو کہیں صنعت کار اس دیس کے بیش بہا خزانوں کو بیچنے کے لیے تمام عملی منصوبہ بندی کو تیزی سے مکمل کرنے پر فائز ہیں۔ چاہے انتخابات میں حصہ لینے والی پارٹیاں ہوں، چاہے سرکار، سب کی پالیسی سازی میں ''جدید'' کی اصطلاح سنہرے حروف میں نظر آتی ہے۔ سرمایہ دار ممالک اب رنگ و نسل کے کھلے تعصب کا اظہار نہیں کرتے لیکن ''معاون'' ہونے کی حیثیت سے ہمیں ہمارے ''پسماندہ'' ہونے کا احساس دلاتے ہوئے جدید ٹیکنالوجی کی کئی ہزار مختلف شکلوں سے ''مسحور'' کررہے ہیں۔ کبھی سبز ٹیکنالوجی بیچی جاتی ہے تو کبھی اورگینک فارمنگ، تو کبھی جینیاتی بیجیں، تو کبھی جدید زراعت۔ یقیناً معاون کا کردار یہ صلاح نہیں دیتا کہ ٹیکنالوجی کو انسانی بقاء کے لیے مفت بانٹا جائے۔ ہمارے ''معاون و مددگار'' صرف سمجھاتے ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی حاصل کرکے ہی ''پائیدار ترقی'' ممکن ہے۔ غریب ترقی پذیر ممالک کے کمر توڑ قرضوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے تہذیب کے دعوے دار اپنی تمام تر ٹیکنالوجیوں کو بھاری منافع کے عوض خریدنے کے ''ہمدردانہ احکام'' جاری کرتے ہوئے عوام پر مزید قرض کا بوجھ بڑھاتے جاتے ہیں۔ ڈبلیو ٹی او ان ٹیکنالوجیوں کی ذہنی ملکیت کی حفاظت کے لیے عالمی قانون سازی کے نت نئے حربے لیے ہر وقت کمر بستہ ہے۔ ''دوستانہ شفقت آمیز پالیسی سازی'' کے لیے کئی اور ادارے بھی موجود ہیں جو عالمی سطح پر جدید زرعی پالیسی سازی کو فروغ دیتے ہوئے زرعی کمپنیوں کے لیے راستے ہموار کررہے ہیں۔ ایک مثال کمیٹی آن ورلڈ فوڈ سیکورٹی ہے۔ اس کمیٹی نے خوراک کی خودمختاری کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک نئی اصطلاح ''فوڈ اینڈ نیوٹریشن سیکورٹی'' (خوراک اور غذائیت کا تحفظ) پیش کی ہے۔ جو کہ پاکستان کی سرکار بھی استعمال کررہی ہے۔ پاکستان کی خوراک اور غذائیت پالیسی کا مسودہ عالمی سطح پر ہونے والی سازشوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ عوامی سوچ و نظریہ نے جدید زراعت کو یکسر مسترد کرتے ہوئے خوراک کی خودمختاری کی اصطلاح پیش کی تھی۔ یہ نظریہ ڈبلیو ٹی او اور سرمایہ کار ممالک کے زراعت کے حوالے سے سنگین ارادوں کے برخلاف عوامی خود انحصاری کو ترجیح دیتے ہوئے عوام کی طرف سے ایک مکمل جواب تھا لیکن صاف نظر آرہا ہے کہ تحفظ خوراک اور غذائیت کو فوقیت دی جارہی ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ یہ نئی اصطلاح زرعی کمپنیوں اور دیگر نجی شعبہ کو بھی عالمی بھوک میں ''کمی'' لانے کے لیے ذمہ داری سونپ رہا ہے۔ سوال ہے کہ کیا عوام و کسان اس نئے جال میں پھنس جائیں گے یا سازشی سامراجی ہتھکنڈوں کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا؟

فہرست مضامین

یورپ کے جاگیرادری دور اور نوآبادیاتی تسلط... 2
عوام و کسان کے لیے ڈبلیو ٹی او کیا ہے..... 9
معاشی ترقی سے پائیدار ترقی تک..... 14
یو ایس ایڈ..... 18
تحفظ خوراک اور غذائیت کی قومی پالیسی.... 24
پاکستان مسلم لیگ (ن) کا انتخابی منشور... 31
بائیو فیولز کے لیے عالمی دباؤ..... 32
بات تو سچ ہے مگر..... 34

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے میزیریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون، فیکس: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
ای میل: roots@super.net.pk

یورپ کے جاگیرداری دور اور نوآبادیاتی تسلط کا مختصر تاریخی جائزہ

تحریر: صبیحہ حسن

دنیا کا پیداواری نظام کسانوں اور تمام محنت کشوں کی محنت پر چل رہا ہے مگر ان کی محنت پر عیش کرنے والے ظالمانہ نظام کی کہانی نہ صرف بہت پرانی ہے بلکہ اس میں تسلسل بھی پایا جاتا ہے۔ اس مضمون میں ہم اسی تسلسل کو یورپ کے جاگیرداری دور اور نوآبادیاتی تسلط کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ محنت کشوں کو استحصالی طبقہ ایک شکنجے سے دوسرے شکنجے میں جکڑ کر ان کے خون کے آخری قطروں کو نچوڑنے والے نظام کو فروغ دیتا ہے اور پیداواری قوت کی اس محنت سے پیدا ہونے والی قدر زائد کو اپنے قبضے میں لے کر طبقاتی نظام کے ذریعے حکمرانی کر رہا ہے۔ یہ قدر زائد اگر محنت کشوں کے ہاتھ میں رہے تو نہ غربت ہو اور نہ کوئی ناانصافی بلکہ انسانی مساوات اور برابری کا وہ دور شروع ہو جس کا خواب انسانیت ہر دور میں دیکھتی آئی ہے۔

یورپ کا جاگیرداری دور

انسانی تاریخ جب جاگیرداری دور میں پہنچی تو انسانیت دو ادوار کا تجربہ کر چکی تھی یعنی اشتراکی یا ابتدائی دور اور غلامی کا دور۔1 یورپ میں رومی سلطنت کی زوال پزیری (پانچویں سے گیارہویں صدی) کے ساتھ غلام اور آقا کے بجائے جاگیردار اور کسان کے پیداواری رشتے آہستہ آہستہ زمین کے گرد ارتقاء پزیر ہوئے۔ عیسویں صدی کی شروعات میں شمال سے جرمن، ڈچ اور ڈینش سفید فام ''جنگلی'' قبیلوں کی فتوحات نے یورپ کے شہروں کو ویران کرنا شروع کر دیا اور سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں۔ جس کی وجہ سے ڈاکو اور لٹیرے تجارتی مال ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ لے جانے دیتے۔ ان حالات میں گاؤں شہریوں کی جائے پناہ بن گئے۔ اس تبدیلی سے ایک طرف تو دیہات کی زندگی کسی حد تک خود کفیل ہو گئی لیکن دوسری طرف کسانوں کو اس شاہی متولی (royal vassal) یا جاگیردار کو اپنا آقا ماننا پڑتا جس سے بادشاہ کا ذاتی وفاداری کی بنیاد پر معاہدہ ہوتا۔ اس موقع پر باقائدہ رسومات ہوتیں۔ بادشاہ کی طرف سے دی جانے والی جاگیر اتنی بڑی ہوتی تھی کہ بڑے جاگیردار اپنی زمین کا اچھا اور بڑا حصہ اپنے پاس رکھ کر باقی ان فوجیوں (knights) کو دے دیتے جو ان کا ساتھ دیتے تھے۔ ایسے فوجی کئی لارڈز سے وابستہ ہوجاتے۔ ابتدا میں ان کو دی جانے والے زمین موروثی نہیں تھی، لیکن بعد میں یہ موروثی ہو گئی۔ ''بادشاہ اور بڑے فیوڈل لارڈ ثواب کی خاطر اور چرچ کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے انھیں بھی زمین بطور عطیہ دے دیا کرتے تھے۔ اس عمل نے چرچ کو یورپ کا سب سے بڑا فیوڈل یا جاگیرداری پر مبنی ادارہ بنا دیا۔ فیوڈل لارڈ کی طرح چرچ کو بھی سکہ ڈھالنے، عدالتیں قائم کرنے، زراعت کا انتظام سنبھالنے اور فوجی خدمات انجام دینے کے اختیارات تھے''۔2

کسانوں کی بڑی تعداد متولی یا جاگیردار (جس کے ساتھ فوجی اور مذہبی طاقت کے حامل افراد شامل رہتے) کے قلعے نما گھر (جس کے گرد خندق کھو دی جاتی تھی) کے ارد گرد رہا کرتے اور لارڈ کے لیے دیگر کاموں کے علاوہ فوجی خدمات بھی انجام دیتے۔3 اس کام کے عوض انھیں زمین پر موروثی حق مل جاتا تھا۔ یورپ میں اس دور کے کچھ کسان تو آزاد تھے لیکن زیادہ تر ہاری (serf) کے طور پر اپنے مالک کے لیے کام کرتے تھے یعنی وہ زمین پر کام کرنے کے یوں پابند تھے کہ اس سے بھاگ نکلنا ممکن نہیں تھا، انہیں آزادی خریدنی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی یورپ کے کسانوں کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے مندرجہ ذیل پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں:

- اگر کسان آزادی کا خواہش مند ہوتا تو اسے اپنا تمام اثاثہ مالک کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔ انگلستان میں کسان پر پابندی تھی کہ وہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا، اگر وہ فرار ہوتا تو بھاگے ہوئے غلام کی طرح اس کا تعاقب کیا جاتا۔

- کسان کو لاتعداد ٹیکس دینے ہوتے تھے۔ فیوڈل لارڈز کے ذریعے حکومت کا ٹیکس، اس کی اپنی فصل، مویشیوں اور چرچ کا ٹیکس۔ کھیت میں کام کے علاوہ بیگار کے طور پر اس سے بے تحاشہ کام لیے جاتے۔

- اگر وہ دریا یا نہر سے مچھلیاں پکڑتا، جنگل میں شکار کرتا اور خالی زمینوں پر جانور چراتا تو اسے ان کا بھی ٹیکس دینا پڑتا تھا۔

- اگر کسان کا لارڈ دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا تو اس کے تاوان کی رقم بھی انہیں سے لی جاتی تھی۔

- اگر اس کا لڑکا تعلیم حاصل کرنا چاہتا یا چرچ کی ملازمت کا خواہش مند ہوتا تو اسے جرمانہ دینا پڑتا تھا، کیونکہ اس صورت میں کھیت میں کام کرنے والے کم ہو جاتے تھے۔ اسی لیے جب انگلستان میں سنڈے اسکول شروع ہوا تو فیوڈل لارڈز کی طرف سے یہ شرط تھی کہ لڑکوں کو صرف پڑھنا سکھایا جائے لکھنا نہیں، کیونکہ اس صورت میں وہ ملازمت کر کے باہر جا سکتے تھے۔

- اگر وہ لڑکے یا لڑکی کی شادی کرتا تو اسے اس کے لیے اجازت لینی ہوتی تھی۔ پرانی روایت کے تحت لارڈ کو پہلی رات کا حق تھا، بعد میں کسان جرمانہ دے کر اس حق کو خرید لیتا تھا۔

- کسان کی زندگی ٹیکسوں کی بہتات اور کم آمدنی کی وجہ سے انتہائی مفلسی میں

گزرتی تھی۔ اس کا سماجی رتبہ معاشرہ میں انتہائی کم تر تھا۔ نہ تو اسے قابل عزت سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی اس کا احترام کیا جاتا تھا۔ اطاعت وفرماں برداری اور وفاداری کے جذبات نے اس کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اعلی طبقہ کی نظروں میں وہ ایک جاہل، وحشی، اجڈ اور غیر مہذب تھا جس کے کوئی حقوق نہیں تھے،صرف فرائض تھے۔ سیاسی وسماجی شعور کی کمی کی وجہ سے وہ اس نظام کا عادی تھا اور اس کے خلاف بغاوت کو وہ جرم گردانتا تھا۔4

چودھویں صدی میں انگریزوں نے سب سے پہلے ہاری (serf) کی حیثیت کوختم کیا۔ دراصل وہاں کی اشرافیہ کو کسانوں کی بغاوتوں کے سامنا ہونے لگا تھا5 لیکن یہ وہ دور تھا جب زمینی اشرافیہ میں ایک نیا طبقہ ابھرا جو زمین اور تجارت دونوں سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یہ طبقہ ان تاجروں کا تھا جنہوں نے انگلستان سے اون شمالی یورپ برآمد کرنا شروع کردیا تھا۔ اسی طبقے نے اپنی تجارت کی آزادی کے لیے انگریزوں کی پہلی کالونیاں یورپ کے اس علاقے میں بنائی جو اب فرانس میں ہیں۔6 اس تبدیلی کا اثر برطانوی کسانوں پر کس طرح ہوا اس کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> انگلستان میں، قرون وسطیٰ [پانچ سے پندرھویں صدی کا زمانہ] کے زرعی نظام کو غیر حاضر زمیندار کے علاوہ ''احاطہ بندی کی تحریک'' نے بھی نقصان پہنچایا۔ اس زمانے میں زرعی زمین کی احاطہ بندی نہیں کی جاتی تھی کیونکہ اسے کسی حد تک مشترکہ ملکیت کے طور پر تصور کیا جاتا تھا۔ لارڈ اور کسان غذائی اجناس کے کھیتوں کے درمیان بکھری زمین کے کچھ ٹکڑوں اور چراگاہوں کو مشترکہ تصور کرتے ہوئے اسے اپنے لیے استعمال کر لیتے تھے۔ پندرھویں صدی میں کچھ انگریز زمینداروں نے، جو شروع میں بہت زیادہ نہیں تھے، اون کی بڑھتی ہوئی طلب کو مدنظر رکھتے ہوئے زمین کے گرد دیوار بنا کر اسے بھیڑ کے لیے نجی چراگاہ بنانا شروع کردیا۔ احاطہ بندی کا یہ سلسلہ صدیوں چلتا رہا.... اکثر بری خصلت والے جاگیردار تمام مشترکہ چراگاہوں کی زمین اور غذائی اجناس کے کھیتوں کے گرد بھی احاطہ ڈال دیتے۔ ایسا کرنے سے کسانوں کا زمین پر سے حق مکمل طور پر چھین لیا جاتا یا انہیں کچھ پیسے دے دیے جاتے جو جلد ہی ختم ہوجاتے۔ ایسے ہزاروں کسانوں کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا سوائے اس کے کہ وہ دھیاڑی پر کام کریں یا شہر میں کام کریں یا پھر فقیر بن جائیں یا پھر امریکہ ہجرت کرجائیں۔7

نوآبادیاتی دور کی ابتدا

یورپ کی اشرافیہ اور جاگیردار کسانوں کی خون پسینے سے کمائی دولت کو اپنی عیاشی اور شان شوکت پر اڑا رہے تھے۔ اس عیاشی کے لیے وہ مہنگا سازو سامان مشرقی ممالک سے خریدتے تھے کیونکہ ان کے پاس اس وقت اپنے ملک سے برآمد کرنے کے قابل کوئی چیز نہیں تھی۔ اس وقت تجارت مال کے بدلے مال اور سونے چاندی کے عوض ہوتی تھی۔ عرب تاجر چین سے لے کر افریقہ تک کپڑا، ریشم، مصالحہ جات اور جواہرات وغیرہ زمینی اور سمندری راستوں سے یورپ کے مشرقی علاقوں تک پہنچاتے وہاں سے یونان اور اٹلی کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اس تجارت سے اپنا حصہ حاصل کرتیں اور جرمن تاجروں کی مدد سے یورپ کے شمال میں مختلف علاقوں تک اسے پہنچاتیں۔8 یورپ کے مغربی ساحلی ممالک مشرق سے تجارت سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا پارہے تھے۔ لہذا انہوں نے اس تجارتی مراکز تک پہنچنے کے لیے متبادل سمندری راستے تلاش کرنے شروع کیے۔ زمانہ قدیم سے ساحلی یورپ کے لوگ بحری مہمات کے شوقین تھے اور ان کے پاس بڑی بڑی جہاز نما کشتیاں موجود تھیں۔ قطب نما (compass) کی ایجاد اور بارودی اسلحے کی تیاری میں مہارت اور سفید فام ہونے کے ناطے نسل پرستی، یہ سب چیزیں سمندری برتری کے ذریعہ دنیا سر کرکے ان کی حکمرانی قائم کرنے میں کام آئیں۔ اس کام میں پہل دو مغربی یورپ کے ممالک اسپین اور پرتگال نے کی۔

اسپین اور پرتگال: اسپین سے کولمبس نے 1492 میں ہندوستان کو تلاش کرتے ہوئے امریکہ میں نئے علاقے دریافت کیے جو ویسٹ انڈیز (West Indies) کہلائے۔ اس کے بعد پرتگال سے واسکوڈی گاما افریقہ کے جنوب اور مشرقی ساحلی علاقوں سے ہوتے ہوئے ہندوستان، انڈونیشیاء اور فلپائن تک پہنچنے کے بعد 1499 میں اپنے ملک واپس پہنچا۔ اس وقت اس کے تجارتی سامان کی قدر اس کے سفری خرچ سے 60 گنا زیادہ تھی۔9 دراصل پندرھویں صدی کے بعد ہی سے پرتگیزیوں نے افریقہ کے مغربی ساحلوں سے سونا، ہاتھی دانت اور غلاموں کی تجارت شروع کردی تھی۔ رومی سلطنت میں مذہب سیاست پر ہاوی تھا اور مسیحی کیتھولک (Catholic) چرچ کا سربراہ ہونے کے ناطے پوپ کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ 1455 میں پوپ کے ایک فرمان نے پرتگال کو مغربی افریقہ کی تجارت کا مالک بنا دیا۔ واسکوڈی گامہ کے سفر کے بعد پرتگال نے مشرق سے تجارت میں اجارہ داری قائم کرنے کے لیے ایشیا کے ساحلی شہروں میں اپنے تجارتی مفادات کے تحفظ کے لیے قلعے تعمیر کیے۔ اس عمل میں ہندوستان کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ''مقامی لوگوں کا قتل عام کرنا اور اذیتیں دینا پرتگیزیوں کے مشاغل میں شامل تھا''۔10

اسپین نے کولمبس کی امریکہ کی دریافت کے بعد وسطی امریکہ میں میکسیکو اور جنوبی امریکہ میں پیرو کو قبضے کے ذریعے اپنی کالونی بنایا۔ پرتگال نے 1500 میں برازیل کو اپنے قبضے میں لیا۔ ہسپانویوں کو یہاں سے اتنا کچھ مل رہا تھا (سونا اور چاندی) کہ انہوں نے پرتگیزیوں سے ایشیا میں مقابلہ کرنا ترک کردیا تھا۔ 1493 کے پوپ کے ایک فرمان نے اسپین کی امریکہ پر تجارتی اجارہ داری کو بھی تقدس قرار دیا۔11 1580 میں فلپ دوئم کے زمانے میں اسپین نے پرتگال کے تخت پر قبضہ کرکے

افریقہ سے لے کر فلپائن تک پرتگال کے تجارتی حقوق خود حاصل کر لیے۔

غلاموں کی تجارت: اس ابتدائی نوآبادیاتی دور کے ساتھ ہی غلاموں کی تجارت ازسرنو شروع ہوئی۔ میکسیکو اور پیرو کی سونے اور چاندی کی کانوں میں کام کرنے، آبادکاری کے لیے وسیع زمین تیار کرنے اور گنے، تمباکو اور کپاس کی فصلوں کے لیے غلام افریقہ سے لائے جاتے۔ والٹر روڈنی کے مطابق ''وہ تجارت نہیں بلکہ جنگ، ڈاکہ اور اغوا کی وارداتیں تھیں''۔12 تمام افریقی علاقوں سے غلام حاصل کیے گئے، تندرست و توانا مرد عورتوں کو زبردستی پکڑ کر جانوروں کی طرح جہازوں میں لاد کر شمالی اور جنوبی امریکہ لایا جاتا۔ اس تجارت نے افریقہ کی آبادی کو عرصے دراز تک بڑھنے نہیں دیا۔ افرادی قوت کی کمی نے زراعت اور افریقی معیشت دونوں کو تباہ کیا۔

دیگر یورپی ممالک: تین یورپی ممالک نے اسپین کے عروج کو ختم کیا۔ سولہویں صدی میں ہالینڈ اور فرانس نے اسپین کے تجارتی جہازوں پر قبضہ اور پرتگیزیوں کے قلعوں کو ہتھیانہ شروع کیا۔ برطانیہ نے سترہویں صدی میں امریکہ میں اسپین کے شہروں پر حملے اور اسپین کے مال بھرے تجارتی جہازوں کو لوٹ کر اپنے نوآبادیاتی سفر کا آغاز کیا۔ 1620 میں شمالی امریکہ (موجودہ یو ایس اے) کے مشرقی علاقوں پر قبضے نے برطانوی تسلط کی راہیں کھولیں۔ برطانوی آبادی کی بڑی تعداد اب شمالی امریکہ منتقل ہونے لگی۔ یورپ میں اس وقت مذہبی فرقہ واریت کی وجہ سے مذہبی جنگوں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ یورپ کی سفید فام آبادی نے شمالی اور وسطی امریکہ کی مقامی آبادی (Native Indians) کو مار کر جنگلوں اور پہاڑوں پر دھکیل دیا۔ بعض جگہوں پر اس قبضے کے لیے جان بوجھ کر جراثیم پھیلائے گئے، جس سے پوری پوری آبادیاں ختم ہوگئیں۔13

انگریزوں نے افریقہ اور ہندوستان میں تجارت کی غرض سے اپنی کوشش بھی اس دوران تیز کردی۔ نوآبادیاتی دوڑ میں اتنی تیزی آ گئی تھی کہ اس نے یورپی ممالک کے درمیان خصوصاً فرانس اور برطانیہ کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکا دی۔ دوسری طرف قابض یورپی آبادی جو اب شمالی امریکہ کو اپنا وطن تصور کرنے لگی تھی نے برطانیہ کے خلاف بغاوت کرکے 1783 میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نام سے ایک آزاد مملکت بنالی۔ کچھ عرصے بعد لاطینی امریکہ بھی اسپین سے آزاد ہوگیا لیکن امریکہ کی نئی ریاست نے اس علاقے کو اپنی نوآبادیات کے طور پر سمجھنا شروع کردیا۔ امریکہ کی آزادی کے بعد یورپی طاقتوں نے ایشیا اور افریقہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی اور ایک صدی کے اندر دونوں براعظم یورپی طاقتوں کے تسلط میں آ گئے۔

یوں تو قوموں کی تاریخ، قبضوں اور لوٹ مار سے بھری پڑی ہے لیکن آج کی تیسری دنیا یعنی ایشیا، افریقہ اور وسطی اور جنوبی امریکہ کی محکومی کا جال جو یورپی ممالک نے بچھایا اس کا تسلسل آج تک جاری ہے۔ براعظم یورپ دنیا کے نقشے پر براعظم ایشیا کا چھوٹا سا مغربی حصہ نظر آتا ہے۔ اس کی حکمرانی کا تسلسل اب بھی کیوں جاری ہے اسے سمجھنے کے لیے ہمیں یورپ میں سرمایہ داری کی ابتدا کو دیکھنا ہوگا۔

سرمایہ داری دور کا آغاز: نوآبادیاتی علاقوں (جو پہلے شمالی، وسطی اور جنوبی امریکہ کے مختلف حصوں تک محدود تھے) سے لوٹی ہوئی دولت اور دنیا بھر سے تجارتی لوٹ کھسوٹ (جس میں غلاموں کی تجارت بھی شامل ہے) کی وجہ سے یورپی ممالک، خاص کر مغربی یورپ اور اس میں بھی سب سے پہلے برطانیہ میں پیداواری رشتے زمین کے بجائے سرمائے کے گرد قائم ہونا شروع ہوگئے۔ سمندری راستوں کے سفر کے ساتھ جب زیادہ علاقے یورپی ممالک کے زیر اثر آئے تو اشیاء کی تجارت میں اضافے کے ساتھ دنیا کے مختلف علاقوں سے رابطے کی وجہ سے یورپ میں علمی جستجو میں بھی بے تحاشہ اضافہ ہوا۔14 امریکہ اور افریقہ کی کانوں سے سونا اور چاندی یورپ پہنچ رہا تھا جس کو سود خوروں نے سود کے کاروبار میں لگایا۔ اس کے بعد بینکوں نے جنم لیا اور سونے اور چاندی کے بجائے نوٹ اور چیک رائج ہوئے۔ شہروں میں رہنے والا طبقہ جسے پہلے حکمران اور اشرافیہ خاطر میں نہیں لاتے تھے اب مضبوط ہوتا چلا گیا۔ اسی نے جدید ریاستی ڈھانچے کا تصور قائم کرکے جاگیرداری کو ختم کیا، سائنسی ترقی کو صنعتی انقلاب سے جوڑا اور مذہب کو سیاست سے الگ کر کے جمہوریت کو فروغ دیا۔15 کاریگروں کی تنظیموں (guilds) کی جگہ فیکٹریوں نے لے لی جہاں کی تیز رفتار پیداوار نے پرانے معیار پر قائم قدروں کو کھوکھلا کر دیا، خود زراعت میں صنعتی طریقے اپنائے جانے لگے اور یوں پیداواری رشتے زمین کے بجائے سرمائے کے گرد گھومنے لگے۔

کسان آبادیوں کا زمین پر سے حق چھین لیا گیا، بے دخل آزاد کسان یا تو زمین پر بحیثیت مزدور کام کرتے یا شہر میں آکر فقیروں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ انہی لوگوں کی جب تعداد شہروں میں بڑھی تو انھوں نے فیکٹریوں میں سستے مزدور کی ضرورت کو پورا کیا اور جاگیرداری دور سے سرمایہ داری دور شروع ہوا اور بہت جلد تجارت کا مرکز مشرق کے بجائے مغرب بن گیا۔ یورپ کی صنعتوں کو خام مال اور منڈی دونوں کی ضرورت تھی۔ ان کو ہتھیانے میں یورپی ممالک کی دوڑ نے آج کی تیسری دنیا کو اپنی کالونی (نوآبادیاتی علاقہ) بنانا شروع کردیا، یوں انیسویں صدی کے آخر میں یورپ کا سرمایہ داری دور سامراجی دور میں داخل ہوگیا۔ اس دور میں برطانیہ دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر قابض ہوکر کے سب سے بڑی سامراجی قوت بن گیا اور ہندوستان برطانیہ کے سب سے بڑے نوآبادیاتی علاقے کے طور پر ابھرا۔

ہندوستان میں برطانوی راج

مضمون کے اس حصے میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر غلبہ کیسے حاصل کیا؟ اس غلبے سے پہلے ہندوستان کی معیشت کیسی تھی اور اس کے بعد یہ کیسی ہوگئی؟ آخر میں برطانوی راج میں ''ترقی'' کا ذکر کسانوں پر اس کے اثرات کے حوالے سے ہوگا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی: اس برطانوی کمپنی کو بجا طور سے جدید بین الاقوامی کمپنی کی ماں کہا جاسکتا ہے۔ 1600 میں انڈونیشیا کے مختلف جزیروں سے مصالحہ جات کی تجارت پر اجارہ داری قائم کرنے کے لیے برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اول نے لندن کے کچھ تاجروں کو خصوصی تجارتی حقوق کا چارٹر یا مسودہ مخصوص ہدایت کے ساتھ جاری کیا۔ اس کے نکات کچھ یوں تھے: تجارت کا فروغ، تجارتی فیکٹریوں کا قیام، مقامی لوگوں کے ساتھ ضرورت پڑنے پر جنگ، برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملک کے تاجروں کو اس علاقے سے تجارت کرنے سے روکنا اور دور رکھنا، مقامی لوگوں کو بحیثیت کلرک، فوجی اور ملاح ملازمت پر رکھنا۔

1601-1612 تک انڈونیشیا اور اس کے قریبی جزیروں (ڈچ ایسٹ انڈیز) کی تجارت سے کمپنی نے خوب فائدہ اٹھایا لیکن ڈچ (ہالینڈ کے باشندے) جو پہلے سے اس تجارت پر قابض ہوچکے تھے نے بالآخر انہیں وہاں سے ہٹایا۔ اس کے بعد کمپنی نے اپنا رخ ہندوستان کی طرف کیا۔ یہاں سے کمپنی پہلے ہی گجرات اور کورومنڈل (Coromandel) کے ساحلوں سے سوتی کپڑا لے کر اس کے بدلے انڈونیشیا اور دیگر جزیروں (ایسٹ انڈیز) سے مصالحہ جات لیتی تھی۔ مغل بادشاہ جہانگیر کو 1608 میں کمپنی تجارتی تعلقات قائم کرنے کے معاملے میں متاثر نہیں کرپائی تھی لیکن 1612 میں اس نے مغلوں سے سورت (Surat) کی بندرگاہ سے تجارت کا پہلا اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس کے بعد احمدآباد اور آگرہ سے تجارت کی اجازت ملی۔ کمپنی کو اس وقت تین طرح کے مسائل کا سامنا تھا: یورپی ممالک سے مستقل مقابلے کا، برطانیہ کے اندر دوسری کمپنیوں کے دباؤ کا (جو مشرق سے تجارت کے حقوق اپنے لیے حاصل کرنا چاہتی تھیں) اور خود مغل انڈیا کی تجارتی پالیسی کا۔ نک روبنز (Nick Robins) اس پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بیرونی ممالک کی ہندوستانی

> ...مارکیٹ تک رسائی کو قابو میں رکھا گیا تھا، مغلوں کی تجارت کی پالیسی نہایت احتیاط اور تفصیل کے ساتھ اس بات کا تعین کرتی کہ کس کے ساتھ کس چیز کی تجارت ہو، یہ فیصلہ معاشی فائدے اور معاشرتی اہمیت کے پہلوؤں کی بنیاد پر ہوتا۔ مغل حکومت اندرونی اور بیرونی تجارت میں واضح فرق کو سامنے رکھتی، غیر ملکی کمپنیوں کو برآمد کا حق چاندی کے حصول کے عوض ہوتا تاکہ بھرے خزانے کے ساتھ معیشت چلتی رہے۔[16]

1670 کی دہائی میں اپنی پالیسی کو تبدیل کرتے ہوئے کمپنی نے ہندوستان سے تجارتی فائدوں کو یقینی بنانے کے لیے زمینی قبضے کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے ہندوستان کے سب سے امیر صوبے، بنگال کی طرف رخ کیا۔ اس کی قبضے کی پالیسی کو ابتدا میں ناکامیوں کا سامنا رہا لیکن اس دوران کمپنی نے اپنی ایک نئی تجارتی فیکٹری دریا ہوگلی کے کنارے تین دیہی علاقوں پر قائم کی۔[17] دو سال بعد اس علاقے پر زمینداری حقوق بھی خرید لیے گئے، یہ جدید کلکتہ کی ابتدا تھی۔ اورنگزیب کے انتقال کے بعد 1717 میں مغل بادشاہ فرخ سیار نے پہلی دفعہ اپنے تین فرمانوں کے ذریعے کمپنی کو ڈیوٹی کے بغیر تجارتی حقوق تین صوبوں میں دیے۔ یہ حقوق بنگال، حیدرآباد (جہاں کورومنڈل کا ساحلی علاقہ ہے) اور احمدآباد میں دیے گئے۔ ان فرمانوں نے ہندوستان میں کمپنی راج کا دروازہ کھول دیا۔

ہندوستان کے امیر ترین صوبے کی معیشت کمپنی راج سے پہلے: کمپنی کی توجہ جب بنگال پر مرکوز ہوئی اس وقت برصغیر کو دنیا کی ورک شاپ کہا جاتا تھا جہاں دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی مصنوعات تیار ہوتی تھی۔[18] بنگال مغل دور کا سب سے امیر صوبہ تھا۔ بنگال کی ٹیکسٹائل کی صنعت میں بڑا تنوع پایا جاتا تھا۔ کمپنی وہاں سے کپڑے کی تقریباً 150 مختلف اقسام خریدتی تھی۔ یہاں کا سوتی کپڑا دنیا میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کی تیاری کے لیے دنیا کی بہترین کپاس ڈھاکہ کے نزدیک میگنا دریا کے کنارے اگائی جاتی تھی۔ بنگال سے کمپنی کی درآمدات 70-1668 میں صرف 12 فیصد تھیں، جو 90-1689 میں 42 فیصد اور 40-1738 میں 66 فیصد ہوگئیں۔[19] لیکن اس وقت کا بنگال صرف ایسٹ انڈیا کمپنی سے تجارت نہیں کررہا تھا۔ اس کی برآمدات میں پورے یورپ کا حصہ صرف ایک تہائی تھا۔[20] زیادہ تر تجارت مقامی اور دیگر ایشیائی تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں کی تجارتی مال کی طلب میں زیادتی کی وجہ سے بنگال کی برآمدات کو بہت اچھی قیمت بھی مل رہی تھی۔

کمپنی کے ہاتھوں بنگال کی تباہی: (1757) میں جنگ پلاسی کی فتح کے بعد کمپنی نے صحیح معنوں میں بنگال میں قدم جمائے۔ کمپنی نے بنگال کے خزانے کو خالی کر دیا اور صوبے کے تمام وسائل نچوڑ لیے۔ بنگال جو ہندوستان کی ٹیکسٹائل صنعت کا مرکز تھا میں کپڑوں کے دستکاروں کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ کمپنی کے ہاتھ اپنا کپڑا کم قیمت پر فروخت کریں اور وہی کپڑا بعد میں مہنگے داموں یورپ میں بیچا جاتا تھا۔ جب برطانیہ میں صنعتی کپڑا بننے لگا تو بنگال میں بہترین کپڑا بنانے والوں کے انگوٹھے کاٹ دیے جاتے تاکہ انگلستان کی فیکٹری میں بننے والا کپڑا، انڈیا میں ہاتھ سے بنے ہوئے عمدہ کپڑے کا مقابلہ کر سکے۔ کاشت کاری پر نئے ٹیکس لگائے جس کی وجہ سے کسان غریب ہوگیا۔ مالیے کی رقم کا بڑا حصہ ہندوستان میں استعمال ہونے کے بجائے باہر بھیج دیا جاتا۔ اس کے علاوہ یورپ کی منڈیوں کی طلب کو دیکھتے ہوئے نقد آور فصلوں کو متعارف کروایا۔ مثال کے طور پر چائے، نیل، کپاس وغیرہ۔ جواہر لال نہرو نے اس صورت حال کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> سیاسی عدم تحفظ اور مشکلات، بارش کی کمی اور برطانوی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی، ان سب نے مل کر 1770 میں بنگال و بہار میں بھیانک قحط کو پیدا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان علاقوں سے تین فیصد سے زائد آبادی ختم ہوگئی۔

ان میں سے ہزاروں بھوک اور فاقے سے آہستہ آہستہ موت کا شکار ہوئے۔21

برطانوی راج: کمپنی کے قدم صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھے بلکہ جنوب مشرقی ایشیا، جاپان اور چین تک اس کا تجارتی جال پھیلا ہوا تھا۔ سنگاپور اور ملیشیا کی بندرگاہ پینانگ (Penang) کو بھی کمپنی نے خرید لیا تھا۔ ہندوستان کے بعد چین سے کمپنی سب سے زیادہ تجارتی فائدہ اٹھارہی تھی۔ چین سے چائے کی مختلف اقسام کمپنی کے ذریعے برطانیہ پہنچ رہی تھیں اور ہندوستان میں بنگال سے کمپنی افیم (opium) چین اسمگل کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ افیم نے نا صرف ہندوستان میں سامراجی تسلط کے لیے درکار رقم کی ضرورت کو پورا کیا بلکہ ''یہ بہت اہم کڑی تھی کاروبار (commerce) کی اس زنجیر میں جس سے برطانیہ نے دنیا کو اپنے گھیرے میں لیا''۔22

ہندوستان میں 58-1857 کی جنگ آزادی نے کمپنی راج کو ختم کرکے برطانوی راج کی راہیں کھولیں۔ کمپنی کے کردار کے حوالے سے بجا طور سے کہا جاسکتا ہے کہ اپنے خاتمے سے پہلے کمپنی نے معاشی تاریخ کا رخ پلٹ دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تقریباً 150 سال تک مشرق سے مغرب تجارت کرتی رہی کیونکہ برطانیہ کے پاس برآمد کرنے کے لیے کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ پلاسی کے بعد بنگال کی لوٹ مار اور پھر چین کو افیم کی برآمد نے کمپنی کو تجارتی دھارے بدلنے میں کامیابی عطا کی۔23 1858 تک یورپ کی معیشت چین اور ہندوستان کی معیشت سے دگنی ہوگئی تھی۔ جدول ملاحظہ ہو:

دنیا کی جی ڈی پی 1870-1600 کے دوران

(1990 کے ڈالر کے حساب سے)

	1600	کل%	1700	کل%	1870	کل%
برطانیہ	6007	1.80	10709	2.88	100179	9.10
مغربی یورپ	65955	20.02	83395	22.46	370223	33.61
چین	96000	29.14	82800	22.30	189740	17.23
ہندوستان	74250	22.54	90750	24.44	134882	12.25
دنیا	329417		371369		1101369	

Source: Angus Maddison, "The World Economy", Paris: OECD, 2001, p.261, Table B-18.

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی ''ترقی''

جب ہندوستان نوآبادیاتی غلبے میں پوری طرح جکڑا تو اس وقت خود برطانیہ میں سرمایہ داری نظام مضبوط ہوچکا تھا۔ ہندوستان میں سرمایہ داری اور برطانوی تسلط کو ''ترقی'' کے نام پر فروغ دیا گیا۔ اس ترقی کا مقصد ظاہر ہے کہ برطانوی سامراجی مفادات کا تحفظ اور فروغ تھا۔ اس ترقی نے کسانوں کی زندگی کو کیسے متاثر کیا اس کو Ralph Fox جو برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے تھے نے اپنے 1930 کے تجزیوں میں بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کے تجزیوں پر مشتمل کتاب ''برطانوی سامراج کی نوآبادیاتی پالیسی'' (The Colonial Policy of British Imperialism) سے کچھ اقتباس یہاں پیش خدمت ہیں:

انگریزوں کی لائی ہوئی ترقی کے حوالے سے ریلف فاکس کہتے ہیں کہ اس نے کسان کی حیثیت کو اور کم کردیا۔ اسے منڈی کے لیے ''ٹیکنیکل فصل اگانے پر مجبور کیا گیا۔ اسے اب زیادہ سے زیادہ پیسے کی ضرورت تھی۔ مختلف کاموں کے علاوہ اپنی اور اپنے خاندان کی غذا کے لیے، غذا جو پہلے خود پیدا کرتا تھا''۔24

انگریزوں کی عطا کی ہوئی ترقی میں ریلوے اور نہری پانی کے نظام کا بہت ذکر ہوتا ہے۔ ریلوے کے حوالے سے ایک نقطہ اٹھاتے ہوئے فاکس لکھتے ہیں کہ اس ترقی نے مقامی آمد و رفت کے نظام کو بھی تباہ کردیا جس سے کسان اور دیہی آبادی اپنی کم آمدنی میں اضافہ کرلیا کرتے تھے۔ قدرتی کھاد نہ ملنے سے زمین کی زرخیزی کا نظام بھی متاثر ہوا کیونکہ آمد و رفت کے لیے مال مویشی اب فالتو ہوگئے تھے جنہیں بیچ دیا جاتا۔

ہندوستان میں آب پاشی کا نظام جو اٹھارویں صدی کی جنگوں کی وجہ سے ناکارہ ہوچکا تھا، اسے 1857 کی جنگ آزادی تک نہیں ٹھیک کیا گیا اور اس کے بعد تیزی سے بڑے ڈیم بنائے گئے اور نہریں نکالی گئیں۔ اس کی قیمت زمین اور پانی کے ٹیکس کی شکل میں کسانوں نے ادا کی۔ پانی کے ٹیکس پانی استعمال کرنے کی بنیاد پر نہیں دیا جاتا تھا اس لیے اس کا بوجھ بڑے زمینداروں کے بجائے چھوٹے کسانوں پر پڑا۔25 نہری زمینوں پر ان لوگوں کو آباد کیا گیا جو انگریز کے وفادار تھے۔

مغلیہ دور میں زمین ریاست کی ملکیت ہوتی تھی۔ بادشاہ اپنے وزرا اور منصب داروں کو جو زمین دیتے تھے وہ ان کی ملکیت نہیں ہوتی تھی اور اس پر وراثت کا حق نہیں ہوتا تھا۔ وراثتی حق اسی کسان کا ہوتا تھا جو اس پر کاشت کرتا تھا۔ گاؤں کی آبادی پر اجتماعی ٹیکس ہوتا تھا جس میں کسان بھی اپنا حصہ دیتا تھا۔ اگرچہ اس نظام میں بھی کسان کا استحصال ہوتا تھا لیکن برطانوی راج نے اپنے سامراجی مفادات کے تحت زمینداری نظام متعارف کرایا جس کے تحت چند خاندانوں کو زمین کی بڑی بڑی اراضی دی گئی۔ اس دور میں سندھ اور پنجاب میں زمین کے بڑے بڑے رقبے ٹیکس کی چھوٹ اور زمین کی ملکیت کے حقوق کے ساتھ دیے گئے۔ ان کو دی جانے والی زمین میں کینال کالونیز بھی شامل ہیں۔ انگریزوں نے زمین فوجی مقاصد کے لیے بھی بانٹی اور گھوڑوں کی افزائش کے لیے زمین کے بڑے بڑے رقبے دیہی اشرافیہ کو دیے گئے۔ یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ دراصل برطانیہ نے اپنے ترقی کے دعویٰ کے ساتھ تمام رجعت پسند قوتوں کو ہندوستان میں مضبوط کیا۔ چاہے وہ راجے مہاراجے ہوں،

زمیندار ہوں، مذہبی حلقے ہوں یا تاجر اور بنیے۔ بقول رالف فاکس کہ ''یہ ترقی انگریز سرمایہ داری کے لوٹ کھسوٹ کے مقاصد کے عین مطابق تھی اور عوام کے مفادات کے عین خلاف''۔[26] کسانوں کے حوالے سے حمزہ علوی کہتے ہیں کہ انگریزوں سے پہلے زمیندار کا بنیادی مطمع نظر

> .... کسان کو اپنی زمین سے منسلک رکھنا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر کسان پر سختی یا جبر کرنے میں چند حدود و قیود کو روا رکھنا پڑتا .... لیکن نوآبادیاتی دور کے آغاز سے کسان پر جبر اور ظلم نے ایک نئی جہد اختیار کرلی کیونکہ نئے حالات میں کسان کو بے دخل کرنا ممکن ہوگیا تھا۔ اب کسان یا مزارعین کو زمیندار کے پاس آ کر کاشتکاری کے لیے زمین کی استدعا کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ زمیندار کی طرف کسان پر روا رکھے جانے والے ظلم و جبر کی اب کوئی انتہا نہ رہی۔[27]

زمینی اصلاحات کے حوالے سے بنگال میں ٹیننسی ایکٹ (Tenancy Act) کا ذکر کرتے ہوئے فوکس کہتے ہیں کہ انیسویں صدی کی وسط میں پٹ سن بنگال کی سب سے قیمتی فصل بن چکی تھی لیکن اس وقت بنگال میں زمینداری کا بوجھ ناقابل برداشت ہوچکا تھا۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں کسان نہ صرف انگریزوں کے خلاف کھڑے ہوئے بلکہ زمیندار اور ان کے کارندوں کے خلاف بھی۔ انگریزوں نے جلد ہی سبق سیکھتے ہوئے 1859 میں بنگال ٹیننسی ایکٹ پاس کردیا جس کے تحت ''ان تمام کسانوں کو جو زمین پر 12 سال سے کاشت کاری کررہے تھے، تجدید معیاد (مزارعے یا ہاری کو زمین پر کاشت کاری کا حق) کا حق مل گیا اور کرائے کو بھی اب عدالت کی اجازت کے بغیر نہیں بڑھایا جاسکتا تھا''۔[28]

اس کا نتیجہ کچھ یوں نکلا کہ ''بنگال میں زمینداری کے پیچیدہ نظام کی وجہ سے کسانوں کی اکثریت کے لیے ناممکن تھا کہ وہ ثابت کرسکیں کے وہ 12 سال سے متواتر کسی مخصوص زمین پر کام کررہے تھے''۔[29]

انگریز کے ان اصلاحی اقدام کا فوری اثر یہ ہوا کہ بنگال میں پٹسن کی پیداوار خوب بڑھی اور خوشحال کسانوں کا چھوٹا سا ٹولہ پیدا ہوا لیکن

> ''... یہ ایک اور رکاوٹ ثابت ہوئی۔ کسانوں کا خون چوسنے والا نیا طبقہ پیدا ہوا جس نے خود زمین پر کام کرنا بند کرتے ہوئے اپنی زمین کرائے پر دے دی اور خود بنیے اور زمیندار کا کردار اپنا لیا''۔[30]

دوسری طرف غذائی اشیاء کی برآمد نے 1856 میں اوڑیسہ اور 74-1873 میں بہار میں قحط نے کسان کو دیوار سے لگا دیا۔ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر جو سرکاری امداد انہیں فراہم کی گئی اسے بھی انگریز سرکار نے یہ کہہ کر رکوا دیا گیا کہ یہ بے کار خرچہ ہے۔ 78-1876 میں جب جدید تاریخ کا سب سے بڑا قحط ہندوستان میں آیا جس میں پانچ سے چھ ملین افراد ہلاک ہوئے تو برطانیہ نے کسی قسم کی امداد کی زحمت نہیں کی۔ یہاں رالف فوکس لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندوستان میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں مر رہے تھے لیکن انگریز آزاد تجارت کے مقدس اصول کو اپناتے ہوئے، معمول کے مطابق غذائی اشیاء ہندوستان سے برآمد کررہے تھے۔ انہوں نے مالیے کی بھاری رقم قحط سے متاثرہ اضلاع میں آدھے پیسہ (penny) کی بھی کمی نہیں کی''۔[31]

اس کے بعد انیسویں صدی کا ایک اور قحط 97-1896 میں آیا۔ اس میں 70 ملین لوگ بھوک کا شکار ہوئے اور ہر دس میں سے ایک موت کا شکار ہوا۔ 1896 میں تاعون کی وبا بھی پھیلی جس میں تین ملین لوگ ہلاک ہوئے۔ مائیک ڈیوس (Mike Davis) اپنی معارکہ آرا کتاب ''لیٹ وکٹورین ہولوکاسٹ'' میں اس زمانے میں یکے بعد دیگرے قحط کی صورت حال کو موسمی تبدیلی سے جوڑتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سامراجی پالیسی کے تحت لائی جانے والی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ دراصل ''یہ نقد آور فصلوں میں اضافے اور غذائی پیداوار اور غذائی تحفظ میں کمی کے ساتھ ساتھ ہوا''۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> اگر ہندوستان میں برطانوی راج کی تاریخ کو ایک حقیقت میں بیان کیا جائے تو یہ ہے: ہندوستان کی فی کس آمدنی میں 1947-1757 تک کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ انیسویں صدی کے آخری حصے میں آمدنی میں کمی 50 فیصد سے بھی زیادہ ہوئی۔[32]

آزاد تجارت کا دوسرا دور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد عالمگیریت کے نام پر پھر سے شروع ہوا ہے جس میں چھوٹا کسان نوآبادیاتی دور کی جھلک اب بھی دیکھ سکتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ ابتدائی دور میں پتھر کے اوزار، آگ، بیج اور پہیے کی ایجاد نے انسان کو "ترقی" سے آشنا کروایا مگر اس ترقی کی روشنی یکساں پھیلنے نہیں پائی۔ اس کے ذریعے حاصل کی ہوئی طاقت نے انسانوں کی کثیر آبادی کو آزادی سے غلامی کی طرف دھکیل دیا۔ بیج جس سے زراعت کی بنیاد پڑی کہا جاتا ہے کہ اس کی دریافت اسی دور میں عورتوں نے کی۔ اب انسان دریا کے کنارے زرخیز وادیوں میں آباد ہوتا نظر آیا لیکن اس کے ساتھ ہی معاشرہ غلام اور آقا کے رشتے کے گرد قائم ہوتا ہے۔ غلاموں کو اشیاء کی طرح بیچا اور خریدا جانا ایک منافع بخش کاروبار ہوگیا کیونکہ زراعت اور دیگر تمام کام انھیں سے کروائے جاتے تھے۔ اس نوعیت کا نظام قبل مسیح سے عیسوی صدی کے بعد کی کئی صدیوں تک نظر آتا ہے۔

2۔ علی، مبارک ایڈیٹر۔ ''جاگیرداری''۔ 2012، صفحہ 25۔

3۔ ایضاً۔

4۔ ایضاً، صفحہ 31-29۔

5۔ یورپ بھر میں 1348 میں طاعون کی وبا پھیلی جس سے گاؤں کے گاؤں ختم ہوگئے۔ اس کے بعد کسانوں کی تعداد اتنی کم ہوگئی تھی کہ ان کی قدر میں اضافہ ہوگیا۔ جو رہ گئے بہتر زندگی اور آزادی کے لیے کھڑے ہونا شروع ہوئے۔

6. Fox, Ralph. "*The colonial policy of British imperialism*". Karachi, Oxford University Press, 2008, p.7.

7. Carlton J and Hayes, H. "*Modern history*". New York, The Macmillan Company, 1939, p.71.

8. *Ibid*, p.46.

9. *Ibid*, p.50.

10۔ علی، مبارک ایڈیٹر۔ ''تاریخ اور سیاست'' میں جیریمی لیگ اور موئرم علی ''ابتدائی نوآبادیاتی نظام کی لوٹ کھسوٹ'' لاہور، فیکشن ہاؤس۔ 2012، صفحہ 94۔

11۔ ایضاً، صفحہ 92۔

12. Rodney, Walter. "*How Europe under developed Africa*". Washington, Howard University Press. 1982, p.95.

13۔ علی، مبارک ایڈیٹر۔ ''تاریخ اور سیاست''۔ صفحہ 94۔

14۔ قدیم چین، ہندوستان اور یونان کا علم جسے مسلمانوں نے آگے بڑھایا اب یورپ کے ہاتھ لگا۔ قدرت کے رازوں کو جاننے کے بعد اس کو ''ٹیکنالوجی'' کے نام پر یورپ سے ابھرتے ہوئے طبقے نے بیچنا شروع کیا اور یوں ''سائنس کی اسیری'' کا زمانہ شروع ہوا۔

15۔ چھاپے خانے کا استعمال اس وقت سترہویں صدی میں عام ہونا شروع ہوا جب کوپرنیکس (پولینڈ کے رہنے والے) اور گالیلیو (اٹلی کے پروفیسر) جیسے لوگوں کے سائنس کی بنیاد پر تجربے مذہبی عقائد کی بنیادوں کو ہلا رہے تھے۔ مذہبی عقائد کی اصلاح اس سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی جس سے یورپ میں فرقہ واریت بہت بڑھ گئی۔ مگر یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ مذہبی اصلاح پسند کہاں کھڑے تھے۔ مثلاً مارٹن لوتھر نے 1525 کی کسان بغاوت میں اشرافیہ کا ہی ساتھ دیا تھا (ان کے ماننے والوں کو پروٹیسٹینٹس {protestants} کہا جاتا ہے)۔ اسی طرح فرانس کے جان کالون (John Calvin) جن کی بہت عزت تھی سمجھتے تھے کہ مذہب میں قرض پر سود لینا حرام نہیں ہے۔ اسی لیے وہ یورپ کی تاجر برادری اور بینکنگ کے شعبے سے تعلق رکھنے والوں میں بہت مقبول تھے۔ دیکھیے کارلٹن جی ایچ ہیز اور پارکر تھامس مون، صفحہ 103، 110۔

16. Robins, Nick. "*The corporation that changed the world*". London, Pluto Press. 2006, p.63.

17۔ کمپنی کو ہوگلی سے ڈیوٹی کے بغیر تجارتی سامان برآمد کرنے کی اجازت 1650 کی دہائی میں مل گئی تھی۔ دیکھیے Robins, Nick، صفحہ 64۔

18۔ ایضاً، صفحہ 61۔

19۔ ایضاً۔

20۔ ایضاً۔

21۔ علی، مبارک ایڈیٹر۔ ''تاریخ اور سیاست''، صفحہ 93

22. Davis, Mike. "*Late Victorian holocausts*". London, Verso. 2001, p.300.

23. In the words of Nick Robins: "By the time of its demise, the company had changed the course of economic history, reversing the centuries old flow of wealth from west to east". see Robins, Nick. p.7.

24. Fox, Ralph. p.27.

25. *Ibid*, p.24.

26. *Ibid*, p.27.

27۔ حمزہ علوی، جاگیرداری اور سامراج، لاہور، صفحہ 42۔

28. Fox, Ralph. p.25.

29. *Ibid*.

30. *Ibid*.

31. *Ibid*, p.27.

32. Davis, Mike, p.311.

حوالہ جات: یو ایس ایڈ اور پاکستانی زراعت

1. DAWN. "*Sarsabz Pakistan expo opens today*." April 4, 2013, accessed from http://dawn.com/2013/04/04/sarsabz-pakistan-expo-opens-today/.
2. DAWN: Advertisement Supplement. "*United States of America Report.*" Dawn & USAID, February 8, 2013.
3. Semiotics Consultants (Pvt) Ltd. USAID - FIRMS PROJECT, accessed from http://www.semiotics.pk/default.aspx?docid=61.
4. http://govinfo.library.unt.edu/hpr/library/status/mission/musaid.htm.
5. USAID Brochure. "*Medicinal & Aromatic Plants (MAP)*." Organized by NRSP under the USAID's Entrepreneurs Project..
6. Secretariat of the Convention on Biological Diversity, United Nations Environmental Programme. *"Nagoya Protocol on access to genetic resources and the fair and equitable sharing of benefits arising from their utilization to the Convention on Biological Diversity"*. text and annex, Secretariat of the Convention on Biological Diversity, 2011.
7. Laird, Sarah A. 2005. "*Medicinal Plants in International Trade: Conservation and Equity Issues.*" In: Ethnopharmacology, *Encyclopedia of Life Support Systems* (EOLSS), accessed from http://www.eolss.net/Sample-Chapters/C03/E6-79-23.pdf.
8. Guardian "*EU debates biopiracy law to protect indigenous people*," 1 May, 2013, accessed from http://www.guardian.co.uk/global-development/2013/may/01/eu-biopiracy-protect-indigenous-people.
9. Laird, Sarah A. 2005. "*Medicinal Plants in International Trade: Conservation and Equity Issues.*"

عوام و کسان کے لیے ڈبلیو ٹی او کیا ہے؟

تحریر: نوید اقبال

3-6 دسمبر، 2013 کو ڈبلیو ٹی او کا نواں وزارتی اجلاس منعقد ہونا قرار پایا ہے۔ ڈبلیوٹی او ایک ایسا ادارہ ہے جس پر سخت تنقید کی جاتی ہے۔ عوام دوست تنظیمیں آج تک "Junk WTO" یعنی ''ڈبلیو ٹی او کو کچرے میں پھینکو'' کے نعرہ پر مضبوطی سے کھڑی ہیں۔ یہ مضمون اس تنقید کی بنیادی وجوہات کا احاطہ کرتا ہے۔

آج سے تقریباً 27-26 سال پہلے گیٹ کے معاہدے (General Agreement on Tariffs and Trade/GATT) کے تحت لاطینی امریکہ کے ملک یورو گوائے میں یورو گوائے راؤنڈ (Uruguay Round) کے نام سے عالمی تجارت پر بین الاقوامی سطح پر بات چیت شروع ہوئی۔ یورو گوائے راؤنڈ میں جو مسودہ عالمی تجارتی اصولوں کو طے کرنے کے لیے بنایا گیا تھا اس کو ڈنکل ڈرافٹ (Dunkel Draft) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ڈنکل ڈرافٹ کی بنیاد پر جو معاہدہ اور قوانین منظور ہوئے ان کو ایک نئے ادارے کے اندر یکجا کیا گیا۔ اس ادارے کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) یا عالمی تجارتی ادارہ کہا جاتا ہے۔ یہ ادارہ پہلی جنوری 1995 کو وجود میں آیا۔

ڈبلیو ٹی او تجارت کے حوالے سے تین بنیادی شعبہ جات پر لاگو ہوتا ہے: (1) اشیاء (goods) (2) خدمات (services) اور (3) ذہنی ملکیت (intellectual property)۔[1] ڈبلیو ٹی او 60 معاہدوں پر مشتمل ایک ایسا ادارہ ہے جو عالمی تجارت کے لیے قوانین واضح کرتا ہے۔ ڈبلیو ٹی او میں پائے جانے والے کئی ایسے معاہدے ہیں جو کہ تیسری دنیا کی معاشی ترقی اور فلاح بہبود پر شدید منفی اثرات چھوڑتے ہیں۔ ان میں ٹرپس کا معاہدہ (Trade-related Aspects of Intellectual Property Rights/TRIPs)، عالمی زرعی معاہدہ (Agreement on Agriculture/AOA)، سینٹری اینڈ فائٹو سینٹری میورز (Sanitary and Phytosanitary Measures/SPS)، ٹیکنیکل بیریئرز ٹو ٹریڈ (Technical Barriers to Trade/TBT) اور جنرل ایگریمنٹ آن ٹریڈ اینڈ سروسیز (General Agreement on Trade in Services/GATs) شامل ہیں۔

اس سے پہلے کے ڈبلیو ٹی او کے اندر پائے جانے والے معاہدوں کو سمجھا جائے پہلے عالمی تجارت کو بذات خود سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تجارت ایک ایسا شعبہ ہے جو کہ انسانی تاریخ کا ایک اہم حصہ رہا ہے لیکن تاریخ میں ہم نے دیکھا ہے کہ تجارت صرف اشیاء کا ایک ملک سے دوسرے ملک آنا جانا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا حربہ بھی ہے جس سے قوموں کو محتاجی اور غربت میں دھکیلنا ممکن ہے۔

آج کے دور میں تجارت کرنا ایک مہنگا اور مشکل کام ہے۔ تجارت کے لیے سرکار سے اجازت نامے کے علاوہ کافی بڑی رقم، تجارت کرنے والے ملک کے قوانین، منڈی اور صارف کے بارے میں تفصیلی معلومات ضروری ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تجارت کرنے والے افراد یا تو امیر طبقے سے وابستہ ہوتے ہیں یا پھر بڑی بڑی بین الاقوامی نجی کمپنیاں اس شعبہ پر حاوی ہوتی ہیں۔ عوام اور کسان کے پاس نا تو اتنا اثاثہ ہے اور نا ہی اتنی مقدار میں کسی بھی شئے کی پیداوار کہ وہ بین الاقوامی تجارت میں براہ راست حصہ لیں۔

اب اگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ بڑی بین الاقوامی کمپنیاں کن ممالک میں ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ وہ زیادہ تر امیر صنعتی سرمایہ دار ملکوں سے وابستہ ہیں۔ تجارت کن چیزوں کی ہوتی ہے؟ مصنوعات کی تجارت ہوتی ہے اور اب مصنوعات کے علاوہ خدمات کی بھی تجارت شروع ہوگئی ہے۔ مثلاً غیر ملکی اسکول و کالج دوسرے ملک میں آ کر تعلیمی ادارے قائم کرتے ہیں یا پھر غیر ملکی بینک دوسرے ملک میں جا کر خدمات پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح مریض بیرون ملک جا کر علاج کرواتے ہیں یا طالب علم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ امیر ممالک میں خدمات کے کئی شعبہ پائے جاتے ہیں لیکن پاکستان میں ابھی اس کے اثرات کم ہیں۔ اگر ممالک کا جائزہ لیں تو ظاہر ہے کہ تجارت تمام ملکوں میں ہوتی ہے۔ تجارت کے دو حصے ہوتے ہیں، برآمدات اور درآمدات جو ممالک برآمدات زیادہ کرتے ہیں وہ زیادہ منافع کما سکتے ہیں اور ان کے خزانے خسارے سے بچے رہتے ہیں۔ نوآبادیات کے بعد سے تیسری دنیا کے ممالک کی برآمدات کا دارومدار زرعی اشیا پر ہے، جبکہ پہلی دنیا کے سرمایہ دار ممالک کا صنعتی اشیا پر۔ مثال کے طور پر پاکستان کی زیادہ تر برآمدات میں کپاس، چاول اور ٹیکسٹائل کی مصنوعات شامل ہیں۔ جبکہ امریکہ یا یورپ کے ممالک کی برآمدات جدید ٹیکنالوجی پر مبنی اشیاء مثلاً کمپیوٹر، ہوائی جہاز و اسلحہ، صنعتی مشینیں وغیرہ پر ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ان مصنوعات کی پیداوار سرکار نہیں کرتی بلکہ دیو ہیکل کمپنیاں کرتی ہیں۔ اگر اس پس منظر میں ڈبلیو ٹی او پر نظر ڈالیں تو ظاہر ہے کہ ڈبلیو ٹی او دراصل بین الاقوامی کمپنیوں کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے قانون سازی کرتا ہے لیکن ڈبلیو ٹی او کے ممبران کمپنیاں نہیں بلکہ ممالک ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈبلیو ٹی او کے ذریعہ ممالک اپنی اپنی کمپنیوں کے مفادات کا تحفظ کر سکے ہیں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ ڈبلیو ٹی او کے خلاف شدید مخالفت اور مزاحمت پائی جاتی ہے۔

ڈبلیو ٹی او میں پائے جانے والے تجارتی معاہدے اور ان کی بنیاد پر تجارتی قوانین نے عالمی تجارت میں کچھ نئے اصول متعارف کروائے ہیں۔ جن پر عوامی گروہوں کا سخت احتجاج سامنے آیا ہے۔ یہ اصول/قوانین مندرجہ ذیل ہیں:

(1) ڈبلیو ٹی او کے تمام اصولوں اور معاہدوں کی مکمل طور پر لاگو کرنا لازم ہے۔

(2) ڈبلیو ٹی او ہر ممبر ملک کو تجارت کے حوالے سے یکساں تسلیم کرتا ہے۔

(3) تجارت کو آزاد تجارت کے اصولوں پر وضع کیا گیا ہے۔
(4) ذہنی ملکیت جس کا تجارت سے کوئی تعلق نہیں کو ڈبلیو ٹی او کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔
(5) ڈبلیو ٹی او کے تحت زراعت کے شعبہ کو عالمی تجارتی اصولوں کو مکمل طور پر قبولنا لازمی ہے۔

ان پانچ نکات میں پنہاں مسائل کو نیچے بیان کیا گیا ہے۔

ڈبلیو ٹی او ایک عالمی ادارہ ہے یعنی یہ ان تمام ممالک پر لاگو ہوتا ہے جو اس کے ممبر ہیں۔ اس وقت دنیا کے 158 ممالک ڈبلیو ٹی او کے ممبر ہیں۔ ہر ممبر ملک **کو ڈبلیو ٹی او میں پائے جانے والے تمام معاہدوں کو قبول کرنا لازمی ہے۔** ڈبلیو ٹی او کے قیام میں آنے سے قبل ممالک خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک آپس کے تجارتی معاہدے اپنے اپنے ملک کی درآمدی اور برآمدی صلاحیت، ضرورت اور عوام کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے کرتے تھے۔ ذہنی ملکیت کے معاہدے جو پہلے اقوام متحدہ کی دسترس میں تھے اور اب سنگین تبدیلیوں کے ساتھ ڈبلیو ٹی او میں (ٹرپس کے نام سے) شامل کر دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسی ادویات جو عوام کے لیے ضروری تھیں، ریاست خود سے بھی تیار کرتی تھی یا پھر ملکی اور بین الاقوامی کمپنیوں کو اجازت دیتی تھی کہ ان ادویات کو تیار کریں تاکہ ضروری ادویات تک عوام کی رسائی یقینی ہو۔ اس فیصلے کا تعلق ادویات پر لاگو ذہنی ملکیت کے معاہدے (پیٹنٹس/patent) کی بنیاد پر نہیں ہوتا تھا کیونکہ حکومتیں پیٹنٹس کو یا نہیں مانتی تھیں یا پھر اپنی سہولت کی بنیاد پر مانتی تھیں۔ فیصلے عوام کی ادویات تک آسان اور سستی رسائی کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ اب ڈبلیو ٹی او کے ٹرپس معاہدے کے نافذ ہونے کے بعد صرف ایسی کمپنیاں ہی ادویات بنا سکتی ہیں جن کے پاس ان ادویات پر ذہنی ملکیت کی سند یعنی پیٹنٹ (patent) کے حقوق ہوں۔ اس طرح کچھ کمپنیاں جو کہ نئی دوائیاں مارکیٹ میں لاتی ہیں وہ ان ادویات پر پیٹنٹ حقوق منواتے ہوئے اجارہ داری قائم کر لیتی ہیں اور پھر ان کو منہ مانگے داموں فروخت بھی کرتی ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ **ڈبلیو ٹی او ہر ممبر ملک کو تجارت کے حوالے سے یکساں تسلیم کرتا ہے۔** بظاہر تو یہ اصول کہتا ہے کہ جو بھی تجارتی رویہ آپ ایک ڈبلیو ٹی او ممبر ملک کے ساتھ رکھیں وہی ڈبلیو ٹی او کے تمام ممبران کے ساتھ رکھیں۔ یعنی سب سے پسندیدہ ملک (most-favoured-nation/MFN) کا درجہ دیا جاتا ہے۔ سب سے پسندیدہ ملک کے تحت پہلی دنیا اور تیسری دنیا کے ممالک میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً امریکہ اور پاکستان کی معاشی ترقی کو برابر گردانا جاتا ہے یا پھر جرمنی اور فلپائن یا تھائی لینڈ کو برابر مانا جاتا ہے۔ اسی طرح انگلستان اور بنگلہ دیش برابر تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ نہیں ہے۔ یورپی ممالک، امریکہ، جاپان اور دیگر جی-8 کے ممالک معاشی اور سماجی اعتبار سے مستحکم امیر ترین ریاستیں ہیں۔ مثال کے طور پر 1992 میں صرف ادویات کی برآمد سے 7.7 ای سی یو (Ecu) (جو کہ اس وقت یورپی یونین کی کرنسی تھی) کی رقم اضافی تجارت (trade surplus) سے حاصل کی گئی۔[2] یورپ بہت کم ادویات درآمد کرتا تھا اور دوسرے ممالک کو اس کی برآمدات بہت زیادہ تھی۔ 1990 میں جب کے یورو گوائے راؤنڈ میں بحث و مباحثہ چل رہا تھا تو یورپ کی ادویات کی صنعت امریکہ اور جاپان سے بھی آگے خیال کی جاتی تھی۔ اسی طرح امریکہ بھی زیادہ پیچھے نہیں تھا۔ 1970 سے لے کر 1990 تک امریکہ کی ادویات کی صنعت عالمی تجارت میں صف اول پر تھی۔[3] آج تقریباً 22 سال بعد ان ممالک کی ادویات کے شعبہ میں تجارتی قوت برقرار ہے۔ 2013 مارچ میں یورو ایریہ (Euro Area) نے 22.9 بلین یورو کی رقم اضافی تجارت (trade surplus) سے کمائی ہے۔[4] سماجی حوالے سے بھی ان کی عوام بہت بہتر صورتحال میں ہے۔ مثلاً ان کے یہاں نا صرف تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم کے اعداد و شمار اور معیار تیسری دنیا کی غریب ریاستوں سے کہیں زیادہ اور بہتر ہے۔ یہی کچھ حال بچوں کی صحت، صاف پانی کی دستیابی، اموات کی شرح، توانائی اور خوراک تک رسائی وغیرہ کا ہے۔[5] ہر ملک کو یکساں سمجھنے کے دو مسائل ہیں۔ ایک تو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ صنعتی اعتبار سے طاقتور سرمایہ دار ممالک کے پاس کئی طرح کی مصنوعات اور خدمات ہیں جو کہ وہ برآمد کر سکتے ہیں۔ پاکستان جیسی غریب ریاست کے لیے ان ممالک سے تجارت میں مقابلے کے لیے بہت کم مصنوعات ہیں۔ اسی لیے وہ امریکہ اور یورپ سے درآمدات کو تو فروغ دے سکتا ہے لیکن برآمدات کے شعبہ میں پیچھے رہ جائے گا۔ نتیجہ میں غریب ممالک ہمیشہ کم زرمبادلہ کما پائیں گے اور قومی خزانہ ہمیشہ خسارے میں رہے گا۔

اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ برابری کے اصول کا نیشنل ٹریٹمنٹ (national treatment) ہے۔ اس اصول کے تحت ایک دفعہ مصنوعات ملک کے اندر آ جائیں تو ان کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جیسے مقامی مصنوعات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر آپ اپنی زرعی اشیا یا کوئی اور صنعتی پیداوار کو سستا کر کے بیچیں تاکہ وہ منڈی میں زیادہ بکے تو یہ نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی رعایت آپ مقامی پیداواری گروہ (مثلاً کسان یا ماہی گیر) یا پھر مقامی صنعت کو دیتے ہیں تو وہ رعایت غیر ملکی کمپنیوں کو بھی دینی پڑے گی۔

تیسرا اہم اصول جو ڈبلیو ٹی او میں پنہاں ہے وہ **آزاد تجارت کا اصول** ہے۔ ڈبلیو ٹی او کے اہم ستونوں میں ایک ستون کھلی یا آزاد منڈی کا ہے۔ یعنی ہر ملک پر لازم ہے کہ اپنے تمام شعبوں کو باہر سے آنے والی اشیاء کے لیے کھولے۔ دوسرے لفظوں میں منڈی تک رسائی (market access) ایک ایسا اصول ہے جو کہ ڈبلیو ٹی او کے ہر معاہدے میں واضح نظر آتا ہے۔ اس اصول کے تحت تمام ممالک پر یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ وہ درآمدی ٹیکسوں (ٹیرف) کو آہستہ آہستہ کم کرتے ہوئے بالکل ختم کر دیں۔ غریب ممالک کے لیے درآمدی ٹیکس آمدنی کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس مد میں حاصل ہونے والی رقوم عوام کی بھلائی اور دیگر ترقیاتی کاموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ڈبلیو ٹی او چونکہ بین الاقوامی کمپنیوں اور امیر سرمایہ دار ممالک کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے تو تمام غریب ممالک اور ان کی عوام کے مسائل کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں تیسری دنیا کے ممالک کے آئی

ایم ایف سے لیے ہوئے قرضہ جات کو سیلز ٹیکس رجی ایس ٹی لگا کر واپس کیا جاتا ہے۔ جی ایس ٹی کا سب سے زیادہ منفی اثر مزدور طبقہ پر پڑتا ہے جو مہنگائی کے بوجھ تلے پس کر رہ جاتے ہیں۔

درآمدی ٹیکس کم اور ختم کرنے سے مقامی منڈیاں بین الاقوامی کمپنیوں کی مصنوعات سے بھر جاتی ہیں اور مقامی صنعت کار اور چھوٹے پیمانے پر پیداوار کرنے والا طبقہ منڈی میں مقابلے کے قابل نہیں رہتا۔ ڈبلیو ٹی او کا آزاد تجارت کا اصول نوآبادیات کے زمانے میں برطانوی راج کی پالیسیوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ اس پالیسی کے تحت یقینی ہے کہ غریب ممالک نا اپنی عوام کے لیے مقامی صنعت و پیداوار کو مضبوط کر سکتے ہیں اور نا ہی عوام کے لیے فلاح و بہبود کے قابل رہ سکتے ہیں۔

چوتھا نکتہ جو سخت قابل غور ہے **وہ ڈبلیو ٹی او میں ٹرپس کے معاہدے کی شمولیت ہے۔** ٹرپس کا معاہدہ سرمایہ دار صنعتی ممالک کے لیے اہم ترین معاہدہ سمجھا جاسکتا ہے۔ دیوہیکل عالمی تجارتی کمپنیوں کا مختصراً جائزہ لیا جائے تو تقریباً تمام کی تمام امریکہ، کینیڈا اور یورپ سے تعلق رکھتی ہیں۔ تجارت دراصل یہی کمپنیاں کرتی ہیں۔ تجارت یا تو اشیاء کی ہوتی ہے یا پھر خدمات کی۔ دونوں شعبوں میں جدید ٹیکنالوجی منڈی میں فروخت کی جاتی ہے۔

ٹرپس معاہدے کے تحت ہر نئی ایجاد/ٹیکنالوجی پر ذہنی ملکیت کی سند حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سند کے ساتھ نئی ٹیکنالوجی کو ایجاد کرنے والے کو اپنی ایجاد پر مکمل اختیار مل جاتا ہے اور صرف وہی نئی ایجاد کو منڈی میں فروخت کرسکتا ہے۔ کیونکہ اب بیچنے والا صرف ایک ہوتا ہے تو اس کی ایجاد منڈی میں مہنگے ترین داموں پر فروخت ہوتی ہے۔ ذہنی ملکیت کی کئی اقسام ہیں۔ ادویات پر پیٹنٹ، کتابوں، سی ڈی (CD) اور دیگر آڈیووژیول اشیاء پر کاپی رائیٹ، بیجوں پر پلانٹ بریڈرز رائٹس وغیرہ۔ اب سوال یہ ہے کہ سب سے زیادہ نئی ایجادات کہاں ہورہی ہیں؟ اگر بیج کے حوالے سے دیکھا تو نئی ہائبرڈ اور جینیاتی بیجیں زیادہ تر امریکہ میں بنائی جارہی ہیں اور ان پر ذہنی ملکیت کی حقدار بڑی بڑی زرعی اور بائیوٹیکنالوجی کمپنیاں ہیں مثلاً مونسانٹو، پایونیئر، سنجینٹا، وغیرہ۔ کمپیوٹر، موبائل، ڈیجیٹل کیمرہ وغیرہ سب میں استعمال ہونے والی آئی سی ٹیکنالوجی پر امریکی، یورپی یا پھر جاپانی کمپنیوں کی اجارہ داری ہے۔ ان میں سے کچھ قابل ذکر آئی بی ایم، ایپل، توشیبا، نوکیا، سونی اریکسن وغیرہ ہیں۔

ٹرپس تین درجوں پر لاگو ہوتا ہے: (1) نئی اشیاء پر (product patent)۔ (2) اشیاء بنانے کے طریقہ کار پر (process patent) اور (3) استعمال پر (use patent) یعنی اشیاء کن مقاصد کے لیے بنائی گئی ہیں۔ فرض کریں ایک دوا ہے جو سر کا درد ٹھیک کرتی ہے تو اس کا استعمال پیٹنٹ سر کا درد ہے۔ اگر اس دوا کا کوئی دوسرا استعمال دریافت ہو جائے مثلاً خون کو پتلا کرنا تو اس دوا کا یہ دوسرا استعمال الگ سے پیٹنٹ ہوگا۔

چاہے ادویات ہوں، میڈیکل ٹیکنالوجی ہو (مثلاً ایم آر آئی (MRI) یا الٹرا ساؤنڈ) یا جدید طریقوں سے آپریشنز، سب مصنوعات یا طریقہ کار کی ذہنی ملکیت کی سند امیر ممالک کے پاس ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تیسری دنیا کے ممالک ان ٹیکنالوجیوں کو خریدتے ہیں تو مصنوعات اور خدمات کے دام بھی دیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ ٹیکنالوجیوں پر ذہنی ملکیت کے حقوق کے تحت الگ سے بھی بھاری رقم ادا کرتے ہیں۔ ٹرپس کے ذریعے سب سے پہلے سرمایہ دار ممالک نے اس بات کو یقینی بنایا کہ وہ تجارت کے حوالے سے خسارے میں نہ رہیں۔

آئی سی (IC/Integrated Circuit) پر مبنی ٹیکنالوجی کیونکہ آسانی سے کاپی ہوسکتی تھی تو اس عمل سے بچنے کے لیے اب آئی سی اور کئی دیگر ٹیکنالوجیوں کو ذہنی ملکیت کے حقوق کے معاہدے کے ذریعے کاپی ہونے سے روکا گیا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک پر زبردستی قانون سازی کی گئی ہے کہ وہ بھی پہلی دنیا کی ٹیکنالوجیوں کو استعمال کرتے ہوئے ان اشیاء کی پیداوار نہ کرسکیں۔ کیونکہ ہمارے ممالک کو ان ٹیکنالوجیوں کی بھاری رقم ادا کرنی پڑتی ہے اس لیے ہمارے سرکاری خزانے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ یہ لکھنا ضروری ہے کہ ٹیکنالوجی کے دوڑ میں تیسری دنیا کے پیچھے رہنے کی وجوہات نوآبادیات سے جڑی ہوئی ہے۔ سرمایہ دار ممالک نے مرکینٹل سرمایہ دارانہ دور میں نوآبادیات سے خام مال اور مزدور پر قبضہ جماتے ہوئے اس بات کا بھی یقین کرلیا تھا کہ جتنی بھی جدت پر مبنی ٹیکنالوجی اس خطے میں موجود تھی اس کو زبردستی برباد کردیا جائے تاکہ نوآبادیات کی مصنوعات یورپی ممالک میں بنائی گئی مصنوعات کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ آج 60-50 سال کے بعد جب تیسری دنیا کے ممالک ایک دفعہ پھر سے قومی صنعت قائم کرنے کی کوشش کررہے ہیں تو پرانے حربوں کا استعمال کرتے ہوئے تیسری دنیا میں ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کے سارے راستے روکے جارہے ہیں۔

ٹرپس کا ایک اور اہم مقصد نئی ٹیکنالوجیوں کی حفاظت اور ان سے قدر زائد کمانا ہے تو دوسری طرف ''نئے طرز کے خام مال'' کی حفاظت اور ان پر اجارہ داری قائم کرنا بھی ہے۔ اس نئے خام مال کو جینیاتی مواد بھی کہا جاسکتا ہے۔ 1980 کی دہائی میں امریکی سائنس دانوں نے جینیاتی مواد استعمال کرتے ہوئے جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے نت نئی ''زندہ اشیاء'' کی پیداوار شروع کردی۔ جینیاتی مواد تنوع حیات سے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ تنوع حیات (زندہ اجسام مثلاً پھل، پودے، درخت، چرند پرند اور جراثیم) زیادہ سے زیادہ تیسری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ حال ہی میں یورپ کی پارلیمنٹ کی گرین پارٹی کی پارلیمانی ممبر سینڈرین گیلیئر (Sandrine Gelier, Green MEP) کا ایک اخبار میں یہ بیان تھا کہ ''90 فیصد جینیاتی وسائل جنوب میں ہیں جبکہ 90 فیصد پیٹینٹس شمال میں ہیں''۔[6] اس ''خام مال'' کی مالی حیثیت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کو استعمال کرتے ہوئے کئی نئی جینیاتی اشیاء کو منڈی میں لایا جارہا ہے۔ مثلاً کئی طرح کی جینیاتی بیجوں کے علاوہ جینیاتی کیلا، جینیاتی لوبیا اور دیگر جینیاتی غذائی اشیاء۔[7]

پہلی دنیا کی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ٹرپس کے معاہدے کے ذریعہ دنیا کی کل منڈی پر اپنی اجارہ داری قائم کردی ہے۔ تیسری دنیا کے حوالے سے دیکھیں تو تین

بنیادی شعبے صحت، تعلیم اور زراعت بھی اب ٹرپس کے ذریعہ بین الاقوامی کمپنیوں کے شکنجہ میں ہیں۔ ان شعبہ جات سے جڑی تمام اشیاء و خدمات کو بھاری منافع کے ساتھ زبردستی تیسری دنیا کی منڈی میں بیچا جارہا ہے۔ رینیوبل انرجی (دوبارہ پیدا ہونے والی توانائی) کے شعبے میں حالیہ پیش رفت بھی ذہنی ملکیت کے دائرہ کار کے اندر ہے۔ یعنی جدید سبز ٹیکنالوجی پر بھی ذہنی ملکیت کا دعویٰ ہے اور اس کو ہمارے ملکوں میں ٹرپس کے ذریعہ بھاری منافع کے حصول کی خاطر بیچا جائے گا۔

بائیوٹیکنالوجی سے بنائی گئی اشیا زراعت سے جڑی ہوئی ہیں اس لیے ٹرپس کا اثر تیسری دنیا کے کسانوں پر بہت شدید ہوا ہے۔ آج ڈبلیو ٹی او کے بننے کے تقریباً 20 سال بعد منڈی میں جینیاتی بیج تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس طرح زرعی پیداوار کی سب سے اہم ترین ضرورت کسان کے ہاتھ سے نکل کر امریکی دیو ہیکل کمپنیوں، جن میں مونسانٹو سرفہرست ہے، کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ ایک طرف کسان جو کہ بیج کا رکھوالا تھا اب منڈی کے چنگل میں بے بس سا ہوتا جارہا ہے، دوسری طرف امریکی کمپنیاں تنوع حیات میں پائے جانے والی جینیاتی وسائل پر نت نئے طریقے اختیار کرتے ہوئے قبضہ کرتی جارہی ہیں۔

ڈبلیو ٹی او کے قیام کے ساتھ عالمی تجارت میں پانچویں اہم تبدیلی زراعت کے شعبہ کو عالمی تجارت کے اصولوں میں ڈھالنے کی ہے یا دوسرے لفظوں میں اس شعبہ کو آزاد تجارت کے اصولوں کے تحت کھول دینے کی ہے۔ ڈبلیو ٹی او سے پہلے زرعی شعبہ پر عالمی تجارتی معاہدے لاگو نہیں ہوسکتے تھے۔ تیسری دنیا کی کثیر آبادی دیہات سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا روزگار زراعت سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ زراعت خوراک کی پیداوار کی ذمہ دار بھی ہے جو کہ ہر انسان کا بنیادی مسئلہ اور حق ہے۔ اس وجہ سے ریاستیں زراعت کے شعبہ کو آزاد تجارت کے بھینٹ نہیں چڑھاتی تھیں۔ اب ڈبلیو ٹی او کے بعد ایسا ممکن نہیں رہا، کیونکہ ڈبلیو ٹی او ایک عالمی ادارہ ہے جس کا ہر معاہدہ، بشمول عالمی زرعی معاہدے کے مکمل طور پر لاگو کرنا ہر ممبر ملک پر قانونی طور پر لازم ہے۔

ڈبلیو ٹی او کا زراعت میں اپنے پنجے گاڑنے کا اہم ترین حربہ عالمی زرعی معاہدہ ہے۔ اس معاہدے کے ذریعہ امیر ممالک نے زرعی منڈی پر قبضہ جمایا ہے، جو کہ عالمی زرعی معاہدے تین شقوں پر مشتمل ہیں: (1) منڈی تک رسائی (2) مقامی مراعات (3) برآمدی مراعات۔ سب سے پہلے منڈی تک رسائی ہے جس کے ذریعے زرعی بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے تیسری دنیا کے ممالک کی مقامی منڈیوں تک رسائی یقینی بنائی گئی ہے۔ یہ شق اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ہر ملک اپنی زرعی منڈی میں دوسرے ملکوں سے درآمد شدہ زرعی اشیا مثلاً سبزیاں، گوشت، دودھ اور دیگر اجناس بکنے کی اجازت دے۔ مقامی اشیا اور غیر ملکی اشیا کی قیمتوں میں فرق نہیں کیا جاسکتا، یعنی درآمدات پر ٹیکس کو بہت کم کرنا لازم ہے۔ دراصل منڈی تک رسائی برآمدی ٹیکس کو بے تحاشہ کم کرکے حاصل کی جاتی ہے۔ یہی عالمی زرعی معاہدہ کی اہم ترین شق ہے۔ اس شرط کے تحت پاکستان اور ہندوستان جیسے زرعی ممالک کو ٹماٹر پیاز، پھل جیسی اجناس جو کہ وہ باآسانی خود اگاتا ہے، دوسرے ممالک سے اپنے ملک میں آنے دینے کی اجازت دینی پڑتی ہے۔ نتیجہ صاف ہے، آج ہمارے ملک میں ٹماٹر، پیاز ہندوستان سے آرہا ہے، چین سے پیاز، لہسن اور آسٹریلیا سے گوشت مارکیٹ میں موجود ہیں۔

منڈی تک رسائی سے جڑا ہوا مسئلہ نیم تیار شدہ غذائی اشیاء کا بھی ہے۔ ہمارے بازاروں میں مہنگے مہنگے تیار کھانے اور دیگر مصنوعات موجود ہیں۔ مثلاً باہر سے لائے ہوئے آلو کے چپس، سیریلز (cereals)، خشک دودھ، کافی بسکٹ، بچوں کی غذا اور دیگر غذائی اشیاء جو کہ پہلے پاکستان میں بالکل نہیں آتی تھیں۔ دیکھنے میں یہ بھی آرہا ہے کہ خدمات کے شعبہ میں اب غیر ملکی ریسٹورانٹ کھل گئے ہیں۔ غیر ملکی چینز (chains) مثلاً کے ایف سی، میکڈونلڈ، سب وے وغیرہ وہ ''فاسٹ فوڈ'' ریسٹورانٹ ہیں جو نہ صرف نہایت مہنگے کھانے بیچتے ہیں بلکہ صحت کے لیے نقصاندہ بھی ہیں۔

دوسری شق مقامی مراعات چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے لیے موت کا پھندہ ثابت ہوچکی ہے۔ اس شق کے تحت ممالک اپنے کسانوں کو پیداواری عمل کے لیے مراعات (domestic subsidy) صرف ایک حد مقرر تک دے سکتے ہیں۔ اس حد بندی کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ کڑوروں ڈالر کی مراعات امریکہ اور یورپ کے ممالک اپنے کسانوں کو کامیابی سے آج تک دے پارہے ہیں جبکہ غریب ممالک مراعات کی مد میں اب تقریباً کوئی مدد فراہم نہیں کررہے ہیں۔ ڈبلیو ٹی او کے تحت 88-1986 کے سالوں میں جو بھی مراعات ریاستیں اپنے زرعی شعبہ کو فراہم کرتی تھیں کو بنیاد بنا کر مراعات کی شرح طے کی گئی تھی۔ ان سالوں میں مراعات کو بنیاد بناتے ہوئے آنے والے سالوں میں مراعات کو بتدریج کم کرنا تھا۔ کیونکہ ان سالوں میں پہلی دنیا کی زرعی شعبہ کے لیے مراعات کئی لاکھوں ڈالرز میں تھی تو اس کو اگر کم بھی کیا گیا تو امریکی اور یورپی کسانوں کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ جبکہ ہمارے ملکوں میں زرعی شعبہ کو پہلے ہی کم مراعات دی جاتی تھی اور 88-1986 کے بنیاد پر مراعات مزید کم ہوگئی ہیں۔ نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ ایک طرف امریکہ اور یورپ کی مراعات شدہ پیداوار کو ہمارے ملکوں میں باآسانی بیچا جارہا ہے اور دوسری طرف ہمارے کسان کو مہنگائی کے بوجھ تلے دبا کر پیداوار کرنے سے تقریباً قاصر کردیا گیا ہے۔ پی ایم ایل (ن) کے مینی فیسٹو کے مطابق زرعی شعبہ میں بڑھوتری کا تناسب 1980 کی دہائی میں 5.4 فیصد تھا جو کہ 20 سال کے دورانیہ میں کم ہوکر اب صرف 3.2 فیصد رہ گیا ہے۔ مینو فیسٹو میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ اس کی وجہ درآمدات اور برآمدات کا منفی توازن تھا۔

عالمی زرعی معاہدہ کی آخری شق برآمدی مراعات (export subsidy) ہے۔ جس کے تحت ملکوں کو مقامی صنعت کو دی جانے والی برآمدی مراعات کو بھی دھیرے دھیرے کم کرنا ہے۔ اس کے لیے بھی بنیادی سال 88-1986 ہی قرار دیے گئے ہیں۔ ترقی پزیر ملکوں میں بہت کم برآمدی مراعات دی جاتی ہیں۔ جبکہ پہلی دنیا میں برآمدی مراعات بڑے پیمانے پر فراہم کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

قومی مراعات اور برآمدی مراعات کی شقوں سے امریکی اور یورپی زرعی کمپنیاں بے تحاشہ فائدہ اٹھا کر ہمارے کسانوں کے لیے شدید معاشی اور سماجی مسائل پیدا کررہی ہیں۔ ان حالات میں چھوٹا بے زمین کسان اپنی روزی روٹی کیسے حاصل کرسکتا ہے؟ کسان جو کہ عوام کے لیے خوراک کے تحفظ کا ضامن ہے اب صرف مزدوری کے قابل رہ گیا ہے۔ دراصل ہو یہ رہا ہے کہ کسان خون پسینہ ایک کرکے جو اگاتا ہے وہ سستے داموں اس سے لے کر کمپنیاں مہنگے مہنگے داموں پر منافع حاصل کرنے کے لیے منڈی میں بیچتی ہیں۔

خلاصہ

مختصر یہ کہ ڈبلیو ٹی او سرمایہ دار ممالک اور ان کی دیوہیکل کمپنیوں کی طویل عرصے پر متعین حکمت عملی کی ایک شکل ہے۔ اس ادارے میں پائے جانے والے معاہدے دراصل پہلی دنیا کی بین الاقوامی کمپنیوں کا منڈی، خام مال اور مزدور پر قبضہ جمانے کے سوچے سمجھے طریقے ہیں۔ ڈبلیو ٹی او کے قوانین اور اصولوں کے تحت سرمایہ دار امیر ریاستوں اور نیم جاگیردار اور ترقی پزیر ممالک کا مقابلہ ممکن نہیں۔ دونوں کی صنعتی ترقی اور اس سے ابھرنے والی معیشت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے ڈبلیو ٹی او میں جب پہلی دنیا اور تیسری دنیا کی ریاستوں کو ایک ہی سطح پر لاکر ایک سے اصولوں کے تحت تجارت کرنے کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے تو تیسری دنیا سوائے ہارنے کے اور کچھ نہیں کرسکتی۔ نتیجتاً تیسری دنیا کی عوام کے لیے بہتری بھی ناممکن ہے۔

1986 سے لے کر 2005 تک اس ادارے کے خلاف عالمی سطح پر عوام اور سیاسی و سماجی کارکنوں کا شدید مزاحمتی کردار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈبلیو ٹی او کی یلغار پچھلے سالوں میں کم رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سرمایہ دار ممالک نے آزاد تجارت کے اصولوں کو فری ٹریڈ ایگریمنٹس (FTAs) کے ذریعہ الگ الگ ملکوں پر لاگو کردیا ہے، لیکن بہرحال ڈبلیو ٹی او اس سختی کے ساتھ نافذ نہ ہوسکا جس کی امریکہ اور دیگر سرمایہ دار ممالک 1990 کی دہائی میں امید کررہے تھے۔

2005 کے بعد ڈبلیو ٹی او کا کوئی وزارتی اجلاس نہیں ہوا ہے۔ اب اس سال 2013 میں ڈبلیو ٹی او کا نواں وزارتی اجلاس انڈونیشیاء کے شہر بالی میں 3-6 دسمبر کو منعقد کیا جائے گا۔ اس اجلاس کے لیے نئے نئے معاہدے اور تجارت کے لیے نئی شرائط پر بحث و مباحثہ شروع ہوچکا ہے۔ چیلنج کے اگلے شمارے میں نئے معاہدوں یا سرکاری بات چیت پر تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ عوام خاص طور پر کسان کے لیے پھر ایک محاذ کھل چکا ہے۔ ہماری کسان تنظیموں کو اپنی صفیں مضبوط کرتے ہوئے فوراً عملی جدوجہد کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔ 2000 سے کسان کا نعرہ رہا ہے کہ ''ڈبلیو ٹی او کو زراعت سے باہر نکالو'' یا پھر ''ڈبلیو ٹی او کو کچرے میں پھینک دو''۔ پاکستان کے کسانوں نے بھی اپنی ریاست سے مطالبہ کرنا شروع کردیا ہے کہ ڈبلیو ٹی او کے ذریعے ہم اپنی زراعت کو امیر ممالک کی سرمایہ دار کمپنیوں کے بھینٹ نہ چڑھائیں۔ یقیناً یہ مطالبہ قطعاً ناجائز نہیں۔ اس ملک کے سب سے معتبر طبقہ یعنی چھوٹے اور بے زمین کسانوں کی ترقی، خوشحالی اور فلاح بہبود کو ترجیح دیتے ہوئے خوراک کی خودمختاری کی بنیاد پر زرعی شعبہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا ہمارے سرکار کی پہلی اور اہم ترین ذمہ داری ہے۔

حوالہ جات

1. The WTO. "*Understanding the WTO.*" The WTO, 2011, accessed from http://www.wto.org/english/thewto_e/whatis_e/tif_e/utw_chap2_e.pdf.
2. Sayeed, Azra Talat. *"The impact of General Agreement on Tariffs and Trade on the pharmaceutical sector."* Ph.D thesis, University of Minnesota, Minnesota, USA. 1995, p.109.
3. *Ibid*, p.108.
4. Eurostat. *"Euro Area trade surplus widens in March,"* 5/16/2013, accessed from http://www.tradingeconomics.com/euro-area/balance-of-trade.
5. UNIDO. *"Universal energy access focus of New York high-level event,"* 22 September, 2010, accessed from http://www.unido.org/media-centre/press-releases/; FAO. *"The state of food insecurity in the world,"* 2012. FAO; United Nations Children's Fund. "*Levels and trends in child mortality*, Report 2011." Unicef.
6. The Guardian *"EU debates biopiracy law to protect indigenous people,"* 1 May, 2013, accessed from http://www.guardian.co.uk/global-de velopment/2013/may/01/eu-biopiracy-protect-indigenous-people.
7. The Wall Street Journal. *"Why deny biotech to a hungry Africa?"* December 10, 2011, accessed from http://online.wsj.com/article/SB10001424052970204770404577080264187783818.html.

معاشی ترقی سے پائیدار ترقی تک: باشعور فیصلہ سازی کے لیے پہلا قدم

تحریر: عذرا طلعت سعید

اقوام متحدہ کے تحت جون 2012 میں منعقد کیے گئے ریو پلس 20 کے اجلاس کے اختتام پر ایک مسودہ ''دی فیوچر وی وانٹ'' یعنی ''وہ مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' میں نشاندہی کی گئی کہ 2015 میں ملینیم ڈیولپمنٹ گولز کی معیاد ختم ہونے پر عالمی سماج کو آنے والی دھائیوں کے لیے عالمی سطح پر پائے جانے والے معاشی، معاشرتی اور ماحولیاتی مسائل سے نمٹنے کے لیے ایک نئے ترقیاتی لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ اس نئے لائحہ عمل کے لیے ''پائیدار ترقی'' کی اصطلاح استعمال کی جارہی ہے۔ اس حوالے سے پائیدار ترقی کے لیے اہداف تشکیل دینے پر اہمیت دی گئی ہے۔

2000 میں آٹھ ملینیم ڈیولپمنٹ گولز تشکیل دیے گئے تھے۔ یہ گولز یا اہداف وہ اہم ترقیاتی ترجیحات ہیں جو کہ 2000 سے لے کر 2015 کے دورانیہ میں ہر ملک میں سرکاری سطح پر، باقاعدہ منصوبوں کے ذریعہ مکمل کی جانی تھیں۔ یہ آٹھ اہداف مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ انتہائی غربت اور بھوک کا خاتمہ۔
2۔ تمام بچوں کے لیے عالمی بنیادی تعلیم کا حصول۔
3۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان صنفی برابری کا فروغ اور عورتوں کا اختیار بڑھانا۔
4۔ بچوں میں اموات کی شرح کم کرنا۔
5۔ ماں کی صحت میں بہتری۔
6۔ ایچ آئی وی / ایڈز، ملیریا اور دیگر بیماریوں سے لڑائی یا کمی کرنا۔
7۔ پائیدار ماحول کا حصول۔
8۔ ترقی کے لیے عالمی پارٹنرشپ۔

2015 میں ان اہداف کو حاصل کرنے کی معیاد ختم ہوجائے گی۔ گو کہ ان میں سے کچھ اہداف چند ممالک میں حاصل کیے جاسکے ہیں، مگر پاکستان اور دیگر ممالک کی سرکار کا کہنا ہے کہ وہ ان اہداف کو پورے کرنے میں ناکام رہی ہے۔

آئندہ کے لیے مزید عالمی ترقیاتی مقاصد کو ترتیب دینے کے لیے کاوش شروع کی جاچکی ہے، اس ترقیاتی لائحہ عمل کو اس بار لفظ ''پائیدار ترقی'' کے ارد گرد مرتب کیا جارہا ہے۔ گو کہ بین الاقوامی اور قومی سطح پر سرکار بھی اس بحث میں شامل ہے کہ پائیدار ترقی کو کیسے بیان کیا جائے، لیکن ساتھ ساتھ سماج کے دیگر گروہوں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ لفظ ''پائیدار ترقی'' میں جن بنیادی اہداف کو اہمیت دیتے ہیں واضح کریں۔ ان گروہوں میں کسان مزدوروں کا گروہ بھی شامل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم پاکستانی کسانوں اور مزدوروں کو بیان کرنا پڑے کہ ہمارے لیے پائیدار ترقی کیا ہے تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟ اس سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم سے کوئی کہے یا نہ کہے ہماری اپنی بھی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے کہ کسان مزدور اور دیگر پسے ہوئے طبقے یہ طے کریں کے ہمارے لیے لفظ ''ترقی'' اور ''پائیدار ترقی'' کیا معنی رکھتا ہے۔

پائیدار ترقی کو پہلے کچھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''ایسی ترقی جو موجودہ ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے مستقبل کی نسلوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت کو پس پشت نہ ڈالے''۔[1] دوسرے لفظوں میں ایسی ترقی جو قدرت کے نظام میں پائے جانے والی اشیاء کے بے دریغ استعمال و استحصال سے اجتناب کرے تاکہ آنے والی نسلیں ان قدرتی وسائل و ذخائر سے محروم نہ رہ جائیں۔

سب سے پہلے ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا یہ تعریف پائیدار ترقی کے لیے صحیح ہے؟ کیا صرف قدرتی وسائل ہمارے لیے اور ہماری آنے والی نسلوں کے لیے ضروری ہیں؟ کیا انسان اور انسانی سماج پانی، صاف ہوا، جنگلات، زرخیز زمین اور دیگر حیاتیات کے بغیر اس کرہ ارض پر زندگی گزار سکتا ہے؟ کیا مزدور، کسان، زرخیز زمین، پانی، بیج، جانوروں اور دیگر قدرتی اشیاء کے بغیر اپنے لیے اور کل انسانیت کے لیے خوراک اگا سکتے ہیں؟۔

ایک اخباری رپورٹ کے مطابق موسمی بحران کے حوالے سے کچھ حقائق یوں بیان کیے گئے ہیں: افریقہ اور ایشیاء میں ماحولیاتی بحران کی وجہ سے اثرات یعنی حرارت میں شدید تبدیلی (کبھی شدید سردی، کبھی شدید گرمی) سیلاب اور خشک سالی کی وجہ سے لاکھوں افراد مزید غربت میں دھکیل دیے گئے ہیں۔ موسمی بحران اب بھی واضح نظر آرہا ہے اور اگلے 25 سالوں میں مزید شدت اختیار کرجائے گا۔ پھل، فصل، مال مویشی اس بحران سے شدید اثر انداز ہوں گے۔ 2010 میں موسمی حالات کی وجہ سے گندم کی پیداوار روس میں 33 فیصد، یوکرین میں 19 فیصد، کینیڈا میں 14 فیصد اور آسٹریلیا میں نو فیصد کم ہوئی۔ اس حوالے سے پاکستان کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ پاکستان کے تمام زرعی ماحولیاتی زونز (ایگرو ایکولوجیکل زونز) میں درجہ حرارت بڑھنے کی وجہ سے گندم کی پیداوار میں کمی واقع ہوگی۔ پاکستان کی 90 فیصد گندم خشک (arid) اور نیم خشک (semi-arid) علاقوں میں پیدا کی جاتی ہے اور انہی علاقوں میں گرمی کی شدت میں اضافہ کی توقع ہے۔[2] پاکستان کی سینیٹ اسٹنڈنگ کمیٹی آن کلائمٹ چینج (Senate Standing Committee on Climate Change) کے مطابق پاکستان دنیا کے ان 10 ممالک میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے جن پر موسمی بحران کے شدید اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ بحران سیلاب، طوفانی بارش، درجہ حرارت میں اضافہ اور سائیکلون یعنی جھڑوں کی شکل میں سامنے آئیں گے۔[3] سائنس دانوں کو یقین ہے

کہ ''قدرتی آفات'' یعنی موسمی بحران میں کئی گنا اضافہ ہوسکتا ہے۔ سمندری طوفان، شدید گرمی یا شدید سردی اور جنگلات میں آگ، برف کے تودوں کا تیزی سے پگھلنا سب ایسی آفات ہیں جو قدرتی رنگ تو رکھتی ہیں لیکن دراصل انسانی فعل کی وجہ سے رونما ہورہی ہیں۔ لیکن کیا یہ انسانی فعل کسی فرد واحد سے جڑا ہوا ہے؟ یا پھر کسی مخصوص آبادی سے یا ملک سے؟ یا پھر مخصوص طریقہ پیداوار سے؟ موسمی بحران نے پائیدار ترقی کی کھوج لگانے پر ہمیں مجبور کیا ہے۔ موسمی بحران کی ذمہ داری پچھلے ڈیڑھ سو سال پر مبنی ''معاشی ترقی'' پر ڈالی جاتی ہے۔ اس لیے پائیدار ترقی کو حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے معاشی ترقی کو تفصیل سے سمجھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے تاکہ پائیدار ترقی کم از کم ان راستوں کو اختیار نہ کرے جو آج ماحولیاتی بحران اور غربت کے ذمہ دار ہیں۔

معاشی ترقی اور سرمایہ داری

پچھلے ڈیڑھ سو سال میں دنیا میں ''ترقی'' ایک نئے پیداواری نظام کے متعارف ہونے کے بعد ایک خاص معنی رکھتی تھی۔ یہ نیا نظام سرمایہ داری کہلاتا ہے، جس کی بنیادی تعریف کچھ یوں ہے: ''ایک معاشی اور سیاسی نظام جس میں ایک ملک کی تجارت اور صنعت ریاست کے اختیار میں نہیں''۔4 سرمایہ داری ایک ایسا طریقہ پیداوار ہے جس کے تحت ''پیداوار کے ذرائع مثلاً زمین، کانیں، کارخانے اور سرمائے کی دیگر شکلیں نجی ملکیت ہوتی ہیں۔ اس طریقہ پیداوار میں مزدور جس کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا ہے اپنی مزدوری سرمایہ دار کو بیچتا ہے۔ اس نظام میں تمام پیداواری فیصلہ سرمایہ دار کرتا ہے جس کا مقصد منافع کا حصول ہوتا ہے۔''5

سرمایہ داری کی شروعات کو مرکنٹائل ازم کے نام سے جانا جاتا ہے، جو کہ سولہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی کے آخر تک رہا۔ مرکنٹائل ازم میں ترقیاتی سوچ کا محور برآمدات کو بڑھانا اور درآمدات کو روکنا تھا۔ اس ترقی حاصل کرنے کے طرز عمل نے نوآبادیاتی نظام کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان اور ہندوستان کی نوآبادیات میں ہونے والے ظلم وستم اور لوٹ مار کی تاریخ اس ''ترقیاتی'' پالیسی کا نتیجہ ہے۔ ترقی کے لفظ کو سرمایہ داری نظام نے زیادہ معاشی ترقی سے نتھی کردیا۔ اس نظام کی بنیاد صنعتی پیداواری نظام ہے اور یہ نظام مشینی دور سے پہنچانا جاتا ہے، جس کا کل انحصار ایندھن پر ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں کوئلہ، تیل اور قدرتی گیس بطور ایندھن بے تحاشہ استعمال کیا گیا۔ ایندھن کے اس بے دریغ استعمال سے سرمایہ دار کے منافع کمانے کی صلاحیت کئی گنا بڑھ گئی۔

نوآبادیات کے خاتمہ کے بعد نوآبادیات سے چھٹکارا حاصل کرنے والی تیسری دنیا کی نئی ریاستوں کو دوسری جنگ عظیم کے بعد ''معاشی ترقی'' اپنانے کی طرف مائل کیا گیا۔ جس کے تحت تمام ترقیاتی پالیسیوں کو صنعتی ترقی اور زیادہ پیداوار سے منسوب کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تیسری دنیا کی صنعت پہلی دنیا کی صنعت سے بہت پیچھے رہی۔ لیکن اسی صنعتی ترقی کے حصول کے لیے تیسری دنیا کو پہلی دنیا سے مستقل محتاجی کی ڈور سے باندھا گیا۔ کیونکہ ہماری ریاستیں پہلی دنیا نت نئی ٹیکنالوجیوں کو حاصل کرنے کی دوڑ سے آج تک باہر نہ آسکیں۔

پہلی دنیا کی وسیع صنعت جس کا کل انحصار ایندھن کے استعمال پر ہے۔ ایندھن وہ شئے ہے جس کے استعمال سے فضاء میں بڑے پیمانے پر کاربن گیسیز کا اخراج ہوتا ہے۔ 1960 کی دہائی کے بعد سائنس اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ کاربن گیسیز کا اخراج قدرت کے نظام میں توڑ پھوڑ کی کلیدی وجہ ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ جب ایک طرف کاربن گیس کے اخراج میں بے تحاشہ اضافہ ہوا اور دوسری طرف قدرتی وسائل جن کے ذریعہ کاربن اخراج کے اثرات کو قدرے کم کیا جاسکتا تھا کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ لکڑی جو کہ صنعتی پیداوار کی اہم ضرورت تھی کے حصول کے لیے جنگلات کو بڑے پیمانے پر کاٹنا شروع کردیا گیا۔ اس کے علاوہ کئی طرح کی کیمیائی اشیاء ماحولیاتی آلودگی کی بنیاد بن گئیں۔ یہ سارے مسائل دنیا کے قدرتی نظام میں شدید بحران کے باعث بنے۔ جن کی مختصر جھلک اوپر بیان کی گئی ہے۔

سرمایہ داری کے بنیادی اصول

سرمایہ دارانہ نظام چند بنیادی اصولوں پر قائم ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ منڈی کو اختیار ہے کہ وہ اشیاء اور خدمات کی مانگ اور ترسیل کا تعین کرے۔
2۔ اشیاء اور خدمات کو صرف منافع کی بنیاد پر منڈی میں فروخت کیا جائے۔
3۔ ریاست کی منڈی میں مداخلت پر پابندی۔
4۔ مالکان کو نجی ملکیت رکھنے کا یقینی اختیار اور ریاست کی ذمہ داری کہ وہ مالکان کی ملکیت کو تحفظ فراہم کرے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ منڈی کو مکمل اختیار دے دیا جائے کہ وہ اشیاء اور خدمات کے حوالے سے تمام فیصلے کرے۔ اس اصول کے پیچھے جو منطق پیش کی جاتی ہے اس کا تعلق صارفین سے ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی پیروی کرنے والوں کے مطابق صارف کی مانگ اور قوت خرید ہی اشیاء و خدمات کی پیداوار اور قیمتوں کے تعین کی ذمہ دار ہیں۔ جن اشیاء کی ضرورت صارف کو ہوگی اس کی پیداوار بھی ہوگی اور صارف کی قوت خرید اس شئے/خدمات کے دام کے اتار چڑھاؤ کے ذمہ دار بھی۔ اس کے علاوہ سرمایہ داری یہ بھی منواتی ہے کہ جس شئے/خدمات کی صارف کو ضرورت ہے وہ صرف منڈی میں ہی فروخت ہوسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ریاست کا اشیاء و خدمات کی پیداوار اور ترسیل میں کوئی کردار نہیں۔ ہر ضرورت کو منڈی شئے میں تبدیل کردیتی ہے، مثال پانی کی ہے۔ پانی انسان کی بنیادی ضروریات میں اہم ترین ہے اور قدرت کی طرف سے فراہم کیا گیا ہے۔ صنعتی دور نے اس کو بھی بکنے والی شئے کا درجہ دے دیا ہے اور اب پانی منڈی کے ذریعہ ہی فروخت ہوتا ہے۔

منڈی کا ایک اور بنیادی اصول منافع ہے۔ اگر کوئی شئے یا خدمت منافع

بخش نہیں ثابت ہوتی تو اس کو منڈی میں قطعاً فروغ نہیں دینا چاہیے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اصول سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے اہم ستون ہے۔ بغیر منافع کے سرمایہ دار کوئی شئے یا خدمات بیچنے کو تیار نہیں۔ اس لیے چاہے جان بچانے والی ادویات ہوں، غذا ہو، ٹرانسپورٹ ہو، سب کچھ منڈی میں منافع کی بنیاد پر بیچا جاتا ہے۔ سرمایہ داری نظام ایسی قانون سازی کو فروغ دیتا ہے کہ منڈی کو ہر شعبہ کے لیے کھول دیا جائے اور وہ شعبہ منافع خوری کی بنیادوں پر کارفرما ہو۔

منڈی کو فوقیت دینے پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اور اہم اصول تجارت کے حوالے سے ریاست کے کردار کو بہت کم اور مخصوص معاملات تک محدود کرنا ہے۔ کیونکہ منڈی پیداوار اور قیمتوں کے تعین کرنے کے لیے ذمہ دار ہے اس لیے ریاست کسی بھی شئے /خدمات کی پیداوار نہیں کرسکتی چاہے وہ پانی، بجلی، صحت اور تعلیم کے شعبہ جات ہوں یا غذاء کی فراہمی۔ اسی طرح روزگار مہیا کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ سارے امور بشمول مزدور کی اجرت یا اشیاء و خدمات کی قیمت کا تعین نجی مالکان یعنی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دیے جاتے ہیں۔

اہم ترین اصول نجی ملکیت کی موجودگی ہے۔ سرمایہ داری اس اصول کو بہت اہمیت دیتی ہے، کیونکہ نجی ملکیت سرمایہ داروں کا کل اثاثہ اور سرمایہ ہوتا ہے۔ ریاست کے کچھ مخصوص کاموں میں سے ایک سرمایہ دار کی ملکیت کا تحفظ بھی ہے۔ اس طرح ریاست نہ کہ عوام کی بھلائی کے لیے کام کرتے وہ سرمایہ دار کی ملکیت کو تحفظ مہیا کرنے کے لیے تمام آلہ کار متحرک رکھتی ہے۔ قانون سازی جو اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے، اس طرح کی جاتی ہے کہ سرمایہ دار کے مفاد کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مثلاً صنعت کے کام کے اوقات بڑھانے کے لیے قانون سازی تاکہ سرمایہ دار پیداوار بڑھا کر منڈی میں زیادہ اشیاء کی فروخت سے مزید منافع کما سکے، لیکن مزدور کے ضروریات زندگی کے حصول کے لیے اجرت کے لیے قانون سازی نہیں کی جاتی۔ یا پھر کھیت مزدوروں کی باضابطہ یونین سازی میں حصہ لینے پر پابندی ہے تاکہ وہ اپنے لیے بہتر معاش اور بہتر معیار زندگی کے لیے منظم نہ ہو پائیں۔ ریاست کی ترجیحات کی ایک اور مثال آج پاکستان کی زرعی پالیسی میں دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کی طرح غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے ریاست کی طرف سے زرعی زمین کی فراہمی، ٹیکس میں چھوٹ وغیرہ کی سہولت فراہم کررہی ہے۔

اس نظام کے اوپر بیان کیے گئے اصولوں نے آج سیاسی، معاشی اور معاشرتی حوالے سے گہرا منفی اثر ڈالا ہے۔ کیونکہ منافع اس نظام کی بنیاد ہے تو سرمایہ دار کی پوری توجہ منافع کمانے اور اپنی دولت اور اثاثے بڑھانے پر ہوتی ہے۔ منافع کے حصول کے لیے وہ ایسا سیاسی اور معاشی ماحول پیدا کرتا ہے کہ ساری پالیسیاں اس کے لیے مثبت ثابت ہوں۔

منافع کی ہوس کس طرح کے رجحان پیدا کرتی ہے

مزدور کا استحصال: منافع بڑھانے کا ایک طریقہ مزدور کی اجرت کو کم رکھنا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار ایسے خطہ یا ممالک کی طرف رخ کرتا ہے جہاں اس کو سستے سے سستا مزدور حاصل ہوسکے۔ سرمایہ داروں کو اپنے طرف راغب کرنے کے لیے ممالک مزدور قوانین اور انسانی حقوق کے قوانین کو یا تو رد کردیتے ہیں یہ ان قوانین کی پامالی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ منافع بڑھانے اور مزدور طاقت کم کرنے کے لیے سرمایہ داری نظام مشین کا سہارا بھی لیتا ہے۔ جب زیادہ مشینیں صنعت کی بنیاد بن جاتی ہیں تو مزدور کی ضرورت کم سے کم ہوجاتی ہے اور بے روزگاری فروغ پاتی ہے۔ اس طرح ''منڈی'' میں فارغ مزدوروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ''دام'' کا فیصلہ منڈی کرتی ہے تو زیادہ مزدوروں کی موجودگی کی وجہ سے دیہاڑی یا اجرت بھی کم ہوجاتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سرمایہ داری نظام عورتوں کو منڈی میں مزدوری کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس طرح مزدوروں کی مجموعی تعداد عورتوں کے روزگار کی منڈی میں شمولیت سے مزید بڑھ جاتی ہے۔ عورتوں کے پاس ان کے خاندان کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ پدر شاہی نظام عورتوں کو اکثر تعلیم سے محروم رکھتی ہے یا کم اور ناقص تعلیم مہیا کرتی ہے۔ مزدور عورتیں اپنے بچوں اور دیگر خاندان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مرد مزدوروں سے کم اجرت پر کام کرنے پر راضی ہوجاتی ہیں۔ معاشرے کی پدر شاہی روایتوں نے عورت کو کم بولنے، ایثار و ہمدردی، صبر اور خاموش رہنے کا سبق سکھایا ہے۔ اس کے علاوہ عورت کم وقت میں زیادہ کام کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ عورتوں سے جڑی یہ ساری ''خصوصیات'' سرمایہ داری نظام اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرتے ہوئے مزدور کا مزید استحصال کرتا ہے۔ عورت مزدور کے منڈی میں داخل ہونے سے نا صرف منڈی میں مزدور کی اجرت کم ہوجاتی ہے بلکہ اس سے یونین سازی بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ عورتیں آواز اٹھانے یا یونین سازی میں حصہ لینے سے پدرشاہی روایتوں کی وجہ سے کتراتی ہیں۔ سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھانے سے مزدوروں کو فوراً نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ منڈی میں کیونکہ پہلے ہی مزدوروں کی افراط ہوتی ہے تو مزدور اپنے روزگار کی حفاظت کے خاطر ظلم برداشت کرتا ہے اور ناجائز روایتوں اور پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھانے سے گریز کرتا ہے۔ مالکان یا سرمایہ داروں کے پاس نہ صرف صنعت کے حوالے سے پیداواری فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار ہوتا ہے بلکہ تمام مزدوروں کے لیے روزگار فراہم کرنے اور ان کی اجرت کے تعین کا بھی اختیار ہوتا ہے۔ ریاست پر مزدور کی بھلائی کے لیے فیصلہ سازی پر سرمایہ داری پہلے ہی سے بندیشیں لگا چکی ہوتی ہے۔ اس لیے اس نظام میں ریاست کے پاس منڈی کے حوالے سے کسی طرح کا بھی فیصلہ کرنے کا اختیار بہت کم رہ جاتا ہے۔ ریاست نہ تو مزدور کے لیے زیادہ روزگار مہیا کرسکتی ہے اور نہ ہی انہیں بہتر روزگار اور سہولتیں فراہم کرسکتی ہے۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ اس نظام کی سختیاں نہ صرف بیک وقت مسلط ہوتی ہیں بلکہ ان میں بتدریج اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے۔

قدرتی وسائل کا استحصال: سرمایہ داری کا بنیادی اصول منافع ہے۔ سرمایہ دار منافع قائم رکھنے اور اس کی شرح بڑھانے کے لیے ایک طرف مزدوروں کو کم سے کم اجرت دیتا ہے تو دوسری طرف سستے سے سستے خام مال کی تلاش کرتا ہے۔ خام مال دراصل زیادہ تر قدرتی وسائل سے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ اہم ترین وسائل میں زمین پانی، جنگلات و درخت، معدنیات شامل ہیں۔ یہ سارے قدرتی وسائل قدرت نے کسی روک ٹوک کے بغیر انسان اور دیگر جاندار کے لیے فراہم کیے ہیں لیکن منڈی کا اصول ہے کہ ہر شئے جو بک سکتی ہے وہ منڈی میں ہی بکے گی۔ 1980 کی دہائی سے خام مال میں جینیاتی مواد بھی شامل ہوگیا ہے اور یہ مواد جو کسی انسان کی ملکیت نہیں ہوسکتا، اب ملکیت قرار دے دیا گیا ہے۔

جب سے جینیاتی تبدیلی سے پیدا کیے گئے پودے اور جانور منڈی کا حصہ بن گئے ہیں، تنوع حیات بذات خود ایک خام مال کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ تنوع حیات وہ تمام پودے، جانور اور جراثیم ہیں جو کہ زندہ ہیں۔ ان کا جینیاتی مواد حاصل کرکے سرمایہ داری سائنس کو استعمال کرتے ہوئے کئی نئی زندہ اشیاء تیار کرکے منڈی میں فروخت کررہی ہے مثلاً بی ٹی کپاس، بی ٹی مکئی، گولڈن رائس، جینیاتی مرغی، بھیڑ اور دیگر جینیاتی اشیاء۔ اس لیے نہ صرف قدرتی وسائل سے جینیاتی مواد کا حصول اور دیگر اشیاء بنانا ایک سنگین غیر اخلاقی امر ہے بلکہ نئی ''زندہ'' اشیاء بذات خود قدرتی وسائل اور تنوع حیات کی بقاء پر ایک کاری ضرب ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادی ضرورت نئی نئی اشیاء کو منڈی میں متعارف کراکے منافع کمانا ہے اس لیے اس پیداواری نظام کے تحت قدرتی وسائل کا استحصال اور قدرتی بحران ایک لازم و ملزوم حقیقت ہیں۔

معاشی ترقی کے حصول کے لیے سرمایہ داری نظام کا سہارا لیا جاتا ہے اور اس وجہ سے غریب حکومتیں سرمایہ دار اور سرمایہ کاری کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اپنے ملک میں پائے جانے والے قدرتی وسائل کی آسان اور سستی فراہمی کو ایک کاروباری حربے کے طور استعمال کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بڑے بڑے جنگلات لکڑی حاصل کرنے کے لیے کاٹ دیے گئے ہیں اور دوسری معدنیات مثلاً لائم سٹون وغیرہ کے حصول کے لیے اونچے اونچے پہاڑوں کا صفایا کردیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ صنعتی ترقی حاصل کرنے کے لیے صنعتی زراعت کو بھی متعارف کروایا گیا۔ زرخیز اور شاداب زمینوں میں مصنوعی کھاد مثلاً یوریا، ڈی اے پی، زہریلے اسپرے اور دیگر کیمیائی اشیاء کے بے تحاشہ استعمال کو فروغ دیا گیا ہے۔ پچھلی دہائی میں جینیاتی بیج اور جانور بھی مزید آلودگی کے لیے متعارف کروا دیے گئے ہیں۔ اس جدید صنعتی طریقہ پیداوار نے قدرتی وسائل کا استحصال کئی گنا بڑھا دیا، مثلاً صنعتی زراعت مصنوعی بیج پر انحصار کرتی ہے جو زیادہ پانی کی فراہمی اور مصنوعی کھاد کے بغیر اگ نہیں سکتی۔

اگر ہم سرمایہ داری کے چاروں اصولوں کو جوڑ کر سمجھیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت صنعتی ترقی سے کسی بھی ملک کی عوام کی فلاح ممکن نہیں ہے۔ فلاح کیا ہے؟ عوام فلاح کو اپنی بنیادی ضرورتوں سے جوڑتی ہے جن میں سے بہت ساری ضرورتوں کو انسانی حقوق کے ساتھ بھی جوڑا گیا ہے۔ بنیادی ضرورتوں میں خوراک، صحت اور تعلیم، محفوظ رہائش کے ساتھ ساتھ بہتر روزگار اور اپنے لیے فیصلہ سازی کا حق بھی شامل ہیں۔

کیا یہ ساری ضرورتیں منافع کی بنیاد پر صنعتی پیداواری نظام اپنے اندر پنہاں اصولوں کی بنیاد پر فراہم کرسکتا ہے؟ اگر سرمایہ دار اپنے لیے منافع کو رد نہیں کرسکتا تو وہ کیسے مزدور کی اجرت بڑھا سکتا ہے؟ اگر منافع حاصل کرنا ہے تو ظاہر ہے سستے سے سستے خام مال کی تلاش جاری رہے گی۔ اگر زیادہ پیداوار کرنی ہے تو پھر مشینوں پر صنعت قائم رہے گی اور ایندھن کا استعمال بھی جاری رہے گا۔ اب اگر ایندھن کی جگہ متبادل توانائی ایجاد کی جارہی ہے تو اس سے بھی قدرتی وسائل کا استحصال جاری رکھا گیا ہے۔ تیل پیدا کرنے والی فصلوں مثلاً گندم، مکئی اور گنے سے انسان اور حیوان دونوں کی خوراک پر حملہ ہے۔ غذائی اجناس اگانے کے بدلے چونکہ اب تیل کی فصلوں نے لے لی ہے اس لیے زمین کی زرخیزی اور پورے ماحول پر مضر اثرات پڑ رہے ہیں۔

سرمایہ داری نظام کے تحت معاشی ترقی کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ طریقہ پیداوار منافع کو بنیاد بناتا ہے تو نتیجہ میں قدرتی وسائل اور مزدور طبقہ کا استحصال ہوتا ہے اور ان دونوں دائروں میں جب استحصال اتنے بڑے پیمانے پر وجود میں آتا ہے تو نتیجہ میں سماجی ناہمواری، معاشی استحصال اور ماحول میں بگاڑ لازم ہے۔ جس سے نا سماجی بھلائی، نا معاشی فلاح اور نا ہی قدرت کی بقا ممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی سرکاری اداروں نے جب بھی عوامی فلاح کے لیے اہداف کا تعین کیا تو باوجود اس کے وہ حاصل کیے جاسکتے تھے سرمایہ داری نظام کے ہوتے ہوئے کبھی بھی پوری طریقے سے حاصل نہیں کیے جاسکے، کیونکہ وہ منڈی اور منافع کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ ملینیم ڈیولپمنٹ گولز بھی اسکی ایک مثال ہے۔

مزید یہ کہ پچھلے 40-30 سال کے دورانیہ میں سرمایہ داری نے اپنے دائرہ کار کو بڑھانے کے لیے اپنی پالیسی سازی میں شدت لائی ہے۔ ان میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے تحت اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پالیسیوں اور ڈبلیو ٹی او جیسے عوام دشمن اداروں کا قیام شامل ہے۔ ان اداروں نے ڈی ریگولیشن (معاشی معاملات میں حکومت کے کردار میں کمی اور تبدیلی)، نجکاری اور آزاد تجارت کی پالیسیوں کو تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک پر زبردستی نافذ کروایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی کچھ دہائیوں میں بیروزگاری اور مہنگائی عروج پر پہنچ گئی۔ نجکاری کے تحت پانی، غذا، تعلیم، صحت اور ٹرانسپورٹ جیسی اہم ضروریات کو ریاست کے اختیار سے نکال کر نجی مالکان کے حوالے کردیا ہے۔ سرمایہ دار نے ان ساری ضروریات زندگی کو منافع کے حصول کے لیے مہنگے داموں منڈی میں فروخت کرنا شروع کردیا ہے۔ اسی دورانیہ میں ملینیم ڈیولپمنٹ گولز کے تحت دنیا کے کئی ممالک میں مہنگائی، غربت اور بے روزگاری کو کم کرنے میں بری طرح ناکامی ہوئی۔[6] اب جبکہ 2015 کے بعد اقوام متحدہ نئے سرے سے عالمی سماج

یو ایس ایڈ اور پاکستانی زراعت

4-5 اپریل، 2013 کو لاہور میں ڈان میڈیا گروپ اور فاطمہ گروپ کے تعاون سے ڈان سرسبز پاکستان ایگرو ایکسپو کا انعقاد ہوا۔ اس نمائش کا مقصد یوں بیان کیا گیا کہ: ''زراعت سے وابستہ تمام کاروباری شعبہ جات کو یکجا کرنا۔ یہ ایکسپو ایسا موقعہ فراہم کررہا تھا کہ جس کے تحت پاکستانی زرعی منڈی کی صلاحیت کو جانچا جاسکے تاکہ ایسے کلیدی کرداروں کے ساتھ شراکت داریوں کو فروغ دیں جو اس شعبہ کو آگے لے کر جارہے ہیں''۔[1] ایکسپو میں امریکہ اور آسٹریلیا کی ٹیکنالوجیوں کی نمائندگی تھی۔ امریکی امدادی ایجنسی یو ایس ایڈ (یونائیٹڈ اسٹیٹس ایڈ فور انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ) اس ایکسپو میں نمایاں تھی۔ اس کے علاوہ یو ایس ایڈ نے اپنی سرگرمیوں کی شہرت کے لیے اخبار ڈان کے تعاون کے ساتھ 8 فروری، 2013 کو ایک اشتہاری میگزین بھی شائع کی۔[2] یو ایس ایڈ کے حوالے سے ایکسپو اور اس میگزین میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان میں سے دو پروجیکٹس پر یو ایس ایڈ کی طرف سے دی گئی معلومات اور اس پر مختصر تبصرہ پیش کیا جارہا ہے۔

- یو ایس ایڈ کے تعاون سے پاکستان میں ایک 5 سالہ فرمز (FIRMS) نامی پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے جو کہ پانچ ملین امریکی ڈالر (یعنی تقریبا پانچ کروڑ روپے سے زائد) مالیت کا ہے۔[3] اس پروجیکٹ کا بنیادی مقصد یو ایس ایڈ کے اہداف کے عین مطابق ہے۔ فرمز پاکستان میں ایک ایسے متحرک کاروباری شعبے کا قیام چاہتا ہے جو کہ بین الاقوامی سطح پر کاروباری مقابلہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کاروباری شعبہ سے توقع کی جارہی ہے کہ وہ برآمدات میں اضافے کے ساتھ ساتھ زیادہ مالی حیثیت والی خدمات و اشیاء کو فروغ اور زیادہ روزگار فراہم کرے گا۔ کاروبار کی ترقی کے لیے خدمات کے شعبہ کی منڈی کو مضبوط اور پاکستانی عورتوں کے لیے منافع کمانے کے نئے مواقع پیدا کیے جائیں گے اور ان کے کاروبار کرنے کے لیے ماحول میں بہتری لائی جائے گی۔

یو ایس ایڈ کیا ہے؟ یو ایس ایڈ امریکہ کی ایک آزاد وفاقی ایجنسی ہے جو کہ امریکہ کی غیرملکی معیشت اور فلاح بہبود کے حوالے سے دنیا بھر میں امدادی پروگرامز کے انتظام کو سنبھالتی ہے۔ یو ایس ایڈ 5 مخصوص شعبہ جات میں کام کرتا ہے، جن میں ماحول، آبادی وصحت، جمہوریت، بڑے پیمانے پر معاشی بڑھوتری اور قدرتی آفات کے لیے امداد شامل ہیں۔ مخصوص توجہ کا حامل یو ایس ایڈ کا وسیع معاشی بڑھوتری کا پروگرام ہے جس کے مطابق پختہ جمہوریت کی بنیاد مضبوط آزاد تجارت پر مبنی معیشت ہوتی ہے۔ اس پروگرام کے تحت ایسی معاشی ترقی کو فروغ دیا جاتا ہے جو امریکی اشیاء وخدمات کے لیے منڈی کو کھولنے میں مدد فراہم کرے۔[4]

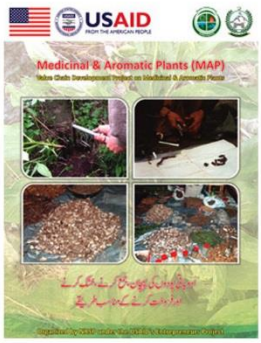

- اس کے علاوہ یو ایس ایڈ انٹرپرینورز کا ادویاتی جڑی بوٹیوں پر کام کرنے کا منصوبہ قابل توجہ ہے۔ اس پروجیکٹ کو این آر ایس پی کی مدد سے چلایا جارہا ہے۔ مقامی جڑی بوٹیاں جو کہ بیماریوں کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہیں پر ایک معلوماتی تحریری مواد ''یو ایس ایڈ انٹرپرینورز کا ادویاتی جڑی بوٹیوں پر کام کرنے کا منصوبہ''(Value Chain Development Project on Medicinal and Aromatic Plants) ایکسپو میں تقسیم کیا گیا۔[5] اس تحریری مواد کے مطابق اس پروجیکٹ کا مقصد سوات کے 13 یونین کونسلوں میں ایسے 9,000 افراد جو جڑی بوٹیوں کے کام سے وابستہ ہیں کو جڑی بوٹیاں جمع کرنے کے حوالے سے تربیت دینا، ان ادویاتی جڑی بوٹیوں کے تحفظ کو یقینی بنانا اور لوگوں کے معاشی حالت کو ان کی فروخت سے بہتر بنانا ہے۔ اس تحریری مواد میں یہ بھی درج ہے کہ اس شعبہ سے 10,400 افراد وابستہ ہیں اور ان کی اوسط ماہانہ آمدنی 4,000-6,000 روپے تک ہے۔

فرمز اور جڑی بوٹیوں کے پروجیکٹ کا جائزہ پاکستانی عوام خاص طور پر دیہی عوام اور کسانوں کے لیے کئی سوال اٹھاتا ہے:

یو ایس ایڈ واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اس کا مقصد اپنے ملک کی مصنوعات اور خدمات کے لیے منڈی قائم کرنا ہے۔ فرمز پروجیکٹ اس کی ایک مثال ہے کیونکہ پاکستان میں کاروباری شعبہ کو اس لیے بڑھایا جارہا ہے کہ امریکی برآمدات کے لیے منڈی قائم کی جائے۔ جب زیادہ مالی قدر والی اشیاء منڈی میں آئیں گی تو ان تک رسائی کیا غریب عوام کے لیے ممکن ہے؟ بین الاقوامی منڈی میں کاروبار کرنے کی سکت کیا چھوٹے کسان میں ہے؟ پھر کاروبار میں وسعت سے کون سا طبقہ فائدہ اٹھائے گا۔

اب اس حوالے سے جڑی بوٹیوں کے کاروباری نوعیت کے پروجیکٹ کو پرکھنا ضروری ہے۔ مقامی آبادیوں کا علم خاص طور پر کرکے جڑی بوٹیوں کے حوالے سے بیش بہا خزانہ ہے۔ اس علم کی حفاظت اور استحصال سے بچنے کے لیے عالمی سطح پر رضاکارانہ معاہدے اور مسودے موجود ہیں۔[6] ان کی ضرورت کیوں پڑی؟ پچھلے 30-40 سال کے عرصے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مغربی ممالک سے سرمایہ دار ادویاتی کمپنیاں اور ان کے سائنس دان تیسری دنیا کی مقامی آبادیوں میں عام طور پر مختلف امراض کے حوالے سے استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں کو جمع کرکے ان کی لیبارٹری میں جانچ پڑتال کے ذریعے فائدہ مند حیاتیاتی مواد الگ کرلیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مقامی لوگوں کے علم کو چراتے ہوئے بین الاقوامی ادویات کی کمپنیاں ''نئی'' ادویات حاصل کرکے ان پر اپنی ذہنی حق ملکیت رائج کردیتی ہیں۔ منڈی میں ان ادویات کے فروخت سے یہ کمپنیاں کروڑوں ڈالر کا منافع حاصل کررہی ہیں۔ مقامی لوگوں کے علم پر ان طریقوں سے قبضہ بائیو پائیریسی (Biopiracy) کہلاتا ہے۔[7] اس طرح کی چوری کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ حال ہی میں اخبار گارڈین میں ایک مضمون چھپا جس کے مطابق 2000 میں جرمن کمپنی شواب (Schwabe) نے جنوبی افریقہ میں پائے جانے والی ایک پودے جرینیم (Geranium) کی مخصوص ورائٹی سے دوا حاصل کرکے اس کو پیٹنٹ کرلیا۔[8] یہ پودا مقامی آبادیاں صدیوں سے سانس کی بیماریوں کے لیے استعمال کررہی تھیں۔ بعد میں افریقن سینٹر فار بائیوسیفٹی کے احتجاج پر اس پودے سے حاصل کردہ دوا کا پیٹنٹ منسوخ کردیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری دیہی آبادیاں زیادہ تر مقامی علم اور جڑی بوٹیوں کے ذریعہ ہی علاج کرتی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جیسے جیسے بڑی بڑی غیرملکی بین الاقوامی کمپنیاں مقامی آبادی سے جڑی بوٹیاں اکٹھی کرواتی ہیں علاقے میں جڑی بوٹیوں کی ''لوٹ کھسوٹ'' بڑھ جاتی ہے۔ جس سے نا صرف یہ قدرتی پودے تباہ ہونا شروع ہوجاتے ہیں بلکہ ان کی بربادی سے ساری تنوع حیات بھی متاثر ہونا شروع ہوجاتی ہے۔[9]

این آر ایس پی اور یو ایس ایڈ کے اس پروجیکٹ سے نظر آرہا ہے کہ جڑی بوٹیوں تک پہنچنے کے کئی طریقے ہیں: مقامی لوگوں کو روزگار فراہم کرکے ان سے جڑی بوٹیوں کے اگنے کے مخصوص مقامات کی نشاندہی، ان کے مقامی علم کے بلبوطے ان کے استعمال، دیکھ بھال اور محفوظ رکھنے کے طریقے پر معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ اس سارے علم کے بدلے لوگوں کو تھوڑے سے پیسے دے کر کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی کمپنیاں روزگار فراہم کررہی ہیں۔ یو ایس ایڈ کیونکہ اپنے ملک کی منڈی اور سرمایہ دار کمپنیوں کے مفاد ہی کو سرفہرست رکھتا ہے اس لئے یہ پروجیکٹ شدید لمحہ فکریہ بھی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پروجیکٹ کے تحت جو معلومات اکھٹی کی جارہی ہیں اس کا استعمال کون کرے گا؟ اگر کل کو اس علم کی بنیاد پر ادویات تیار کی جائیں گی تو ان پر ذہنی ملکیت کس کی ہوگی؟ ہندوستان میں نیم کے جینیاتی مواد کے علاوہ ادرک اور ہلدی کے جینیاتی مواد پر بھی اسی طرح امریکی ادویات کی کمپنیوں نے کئی دفعہ قبضہ جمانے کی کوشش کی ہے۔

دنیا کی بڑی ادویات کی کمپنیاں امریکہ اور یورپ سے وابستہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پہاڑی علاقے کے لوگوں کی معلومات کو تحریر کرکے اس سے کئی بلین ڈالر کی منافع بخش ادویات یہ کمپنیاں تیار کرنے کی مالی اور تکنیکی صلاحیت رکھتی ہیں۔

اگر یو ایس ایڈ کے پروجیکٹس اپنے ملک کی منڈیوں کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں تو پھر ہماری عوام کو خود اپنے علم اور قدرتی وسائل جن میں مال مویشی اور جڑی بوٹیاں دونوں شامل ہیں، کی حفاظت کرنی ہوگی تاکہ ان سے قیمتی حیاتیاتی مواد چرا نہ لیا جائے۔ تھوڑے سے پیسوں اور گنتی کے روزگار کے عوض عوام کے قیمتی اثاثوں پر ڈاکے کے خلاف ہوشیار رہنا چاہیے۔

حوالہ جات کے لیے صفحہ نمبر 8 دیکھیں۔

یو ایس ایڈ اور پاکستانی زراعت

یو ایس ایڈ کیا ہے؟ یو ایس ایڈ امریکہ کی ایک آزاد وفاقی ایجنسی ہے جو کہ امریکہ کی غیر ملکی معیشت اور فلاح بہبود کے حوالے سے دنیا بھر میں امدادی پروگرامز کے انتظام کو سنبھالتی ہے۔ یو ایس ایڈ 5 مخصوص شعبہ جات میں کام کرتا ہے، جن میں ماحول، آبادی وصحت، جمہوریت، بڑے پیمانے پر معاشی بڑھوتری اور قدرتی آفات کے لیے امداد شامل ہیں۔ مخصوص توجہ کا حامل یو ایس ایڈ کا وسیع معاشی بڑھوتری کا پروگرام ہے جس کے مطابق پختہ جمہوریت کی بنیاد مضبوط آزاد تجارت پر مبنی معیشت ہوتی ہے۔ اس پروگرام کے تحت ایسی معاشی ترقی کو فروغ دیا جاتا ہے جو امریکی اشیاء وخدمات کے لیے منڈی کو کھولنے میں مدد فراہم کرے۔[4]

4-5 اپریل، 2013 کو لاہور میں ڈان میڈیا گروپ اور فاطمہ گروپ کے تعاون سے ڈان سرسبز پاکستان ایگرو ایکسپو کا انعقاد ہوا۔ اس نمائش کا مقصد یوں بیان کیا گیا کہ: ''زراعت سے وابستہ تمام کاروباری شعبہ جات کو یکجا کرنا۔ یہ ایکسپو ایسا موقعہ فراہم کررہا تھا کہ جس کے تحت پاکستانی زرعی منڈی کی صلاحیت کو جانچا جاسکے تاکہ ایسے کلیدی کرداروں کے ساتھ شراکت داریوں کو فروغ دیں جو اس شعبہ کو آگے لے کر جارہے ہیں''۔[1] ایکسپو میں امریکہ اور آسٹریلیا کی ٹیکنالوجیوں کی نمائندگی تھی۔ امریکی امدادی ایجنسی یو ایس ایڈ (یونائیٹڈ اسٹیٹس ایڈ فور انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ) اس ایکسپو میں نمایاں تھی۔ اس کے علاوہ یو ایس ایڈ نے اپنی سرگرمیوں کی شہرت کے لیے اخبار ڈان کے تعاون کے ساتھ 8 فروری، 2013 کو ایک اشتہاری میگزین بھی شائع کی۔[2] یو ایس ایڈ کے حوالے سے ایکسپو اور اس میگزین میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان میں سے دو پروجیکٹس پر یو ایس ایڈ کی طرف سے دی گئی معلومات اور اس پر مختصر تبصرہ پیش کیا جارہا ہے۔

- یو ایس ایڈ کے تعاون سے پاکستان میں ایک 5 سالہ فرمز (FIRMS) نامی پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے جو کہ پانچ ملین امریکی ڈالر (یعنی تقریباً پانچ کروڑ روپے سے زائد) مالیت کا ہے۔[3] اس پروجیکٹ کا بنیادی مقصد یو ایس ایڈ کے اہداف کے عین مطابق ہے۔ فرمز پاکستان میں ایک ایسے متحرک کاروباری شعبے کا قیام چاہتا ہے جو کہ بین الاقوامی سطح پر کاروباری مقابلہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کاروباری شعبہ سے توقع کی جارہی ہے کہ وہ برآمدات میں اضافے کے ساتھ ساتھ زیادہ مالی حیثیت والی خدمات واشیاء کو فروغ اور زیادہ روزگار فراہم کرے گا۔ کاروبار کی ترقی کے لیے خدمات کے شعبہ کی منڈی کو مضبوط اور پاکستانی عورتوں کے لیے منافع کمانے کے نئے مواقع پیدا کئے جائیں گے اور ان کے کاروبار کرنے کے لیے ماحول میں بہتری لائی جائے گی۔

- اس کے علاوہ یو ایس ایڈ انٹرپرینورز کا ادویاتی جڑی بوٹیوں پر کام کرنے کا منصوبہ قابل توجہ ہے۔ اس پروجیکٹ کو این آر ایس پی کی مدد سے چلایا جارہا ہے۔ مقامی جڑی بوٹیاں جو کہ بیماریوں کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہیں پر ایک معلوماتی تحریری مواد ''یو ایس ایڈ انٹرپرینورز کا ادویاتی جڑی بوٹیوں پر کام کرنے کا منصوبہ'' (Value Chain Development Project for Medicinal and Aromatic Plants) ایکسپو میں تقسیم کیا گیا۔[5] اس تحریری مواد کے مطابق اس پروجیکٹ کا مقصد سوات کے 13 یونین کونسلوں میں ایسے 9,000 افراد جو جڑی بوٹیوں کے کام سے وابستہ ہیں کو جڑی بوٹیاں جمع کرنے کے حوالے سے تربیت دینا، ان ادویاتی جڑی بوٹیوں کے تحفظ کو یقینی بنانا اور لوگوں کے معاشی حالت کو ان کی فروخت سے بہتر بنانا ہے۔ اس تحریری مواد میں یہ بھی درج ہے کہ اس شعبہ سے 10,400 افراد وابستہ ہیں اور ان کی اوسط ماہانہ آمدنی 4,000-6,000 روپے تک ہے۔

فرمز اور جڑی بوٹیوں کے پروجیکٹ کا جائزہ پاکستانی عوام خاص طور پر دیہی عوام اور کسانوں کے لیے کئی سوال اٹھاتا ہے:

یو ایس ایڈ واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اس کا مقصد اپنے ملک کی منصوعات اور خدمات کے لیے منڈی قائم کرنا ہے۔ فرمز پروجیکٹ اس کی ایک مثال ہے کیونکہ پاکستان میں کاروباری شعبہ کو اس لیے بڑھایا جارہا ہے کہ امریکی برآمدات کے لیے منڈی قائم کی جائے۔ جب زیادہ مالی قدر والی اشیاء منڈی میں آئیں گی تو ان تک رسائی کیا غریب عوام کے لیے ممکن ہے؟ بین الاقوامی منڈی میں کاروبار کرنے کی سکت کیا چھوٹے کسان میں ہے؟ پھر کاروبار میں وسعت سے کون سا طبقہ فائدہ اٹھائے گا۔

اب اس حوالے سے جڑی بوٹیوں کے کاروباری نوعیت کے پروجیکٹ کو پرکھنا ضروری ہے۔ مقامی آبادیوں کا علم خاص طور پر کر کے جڑی بوٹیوں کے حوالے سے بیش بہا خزانہ ہے۔ اس علم کی حفاظت اور استحصال سے بچنے کے لیے عالمی سطح پر رضا کارانہ معاہدے اور مسودے موجود ہیں۔[6] ان کی ضرورت کیوں پڑی؟ پچھلے 40-30 سال کے عرصے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مغربی ممالک سے سرمایہ دار ادویاتی کمپنیاں اور ان کے سائنس دان تیسری دنیا کی مقامی آبادیوں میں عام طور پر مختلف امراض کے حوالے سے استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں کو جمع کر کے ان کی لیبارٹری میں جانچ پڑتال کے ذریعے فائدہ مند حیاتیاتی مواد الگ کرلیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مقامی لوگوں کے علم کو چراتے ہوئے بین الاقوامی ادویات کی کمپنیاں ''نئی'' ادویات حاصل کرکے ان پر اپنی ذہنی حق ملکیت رائج کردیتی ہیں۔ منڈی میں ان ادویات کے فروخت سے یہ کمپنیاں کروڑوں ڈالر کا منافع حاصل کررہی ہیں۔ مقامی لوگوں کے علم پر ان طریقوں سے قبضہ بائیو پائیریسی (Biopiracy) کہلاتا ہے۔[7] اس طرح کی چوری کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ حال ہی میں اخبار گارڈین میں ایک مضمون چھپا جس کے مطابق 2000 میں جرمن کمپنی شواب (Schwabe) نے جنوبی افریقہ میں پائے جانے والی ایک پودے جرینیم (Geranium) کی مخصوص ورائٹی سے دوا حاصل کرکے اس کو پیٹنٹ کرلیا۔[8] یہ پودا مقامی آبادیاں صدیوں سے سانس کی بیماریوں کے لیے استعمال کررہی تھیں۔ بعد میں افریقن سینٹر فار بائیوسیفٹی کے احتجاج پر اس پودے سے حاصل کردہ دوا کا پیٹنٹ منسوخ کردیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری دیہی آبادیاں زیادہ تر مقامی علم اور جڑی بوٹیوں کے ذریعہ ہی علاج کرتی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جیسے جیسے بڑی بڑی غیر ملکی بین الاقوامی کمپنیاں مقامی آبادی سے جڑی بوٹیاں اکٹھی کرواتی ہیں علاقے میں جڑی بوٹیوں کی ''لوٹ کھسوٹ'' بڑھ جاتی ہے۔ جس سے نا صرف یہ قدرتی پودے تباہ ہونا شروع ہوجاتے ہیں بلکہ ان کی بربادی سے ساری تنوع حیات بھی متاثر ہونا شروع ہوجاتی ہے۔[9]

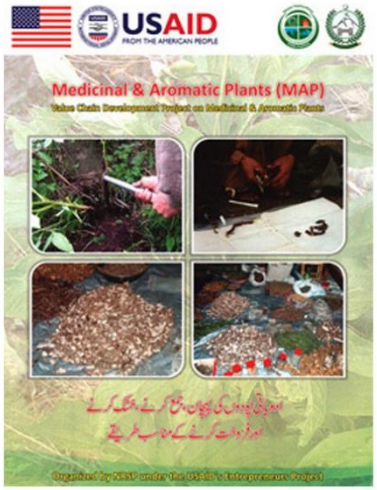

این آر ایس پی اور یو ایس ایڈ کے اس پروجیکٹ سے نظر آرہا ہے کہ جڑی بوٹیوں تک پہنچنے کے کئی طریقے ہیں: مقامی لوگوں کو روزگار فراہم کرکے ان سے جڑی بوٹیوں کے اگنے کے مخصوص مقامات کی نشاندہی، ان کے مقامی علم کے بلبوطے ان کے استعمال، دیکھ بھال اور محفوظ رکھنے کے طریقے پر معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ اس سارے علم کے بدلے لوگوں کو تھوڑے سے پیسے دے کر کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی کمپنیاں روزگار فراہم کررہی ہیں۔ یو ایس ایڈ کیونکہ اپنے ملک کی منڈی اور سرمایہ دار کمپنیوں کے مفاد ہی کو سرفہرست رکھتا ہے اس لئے یہ پروجیکٹ شدید لمحہ فکریہ بھی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پروجیکٹ کے تحت جو معلومات اکھٹی کی جارہی ہیں اس کا استعمال کون کرے گا؟ اگر کل کو اس علم کی بنیاد پر ادویات تیار کی جائیں گی تو ان پر ذہنی ملکیت کس کی ہوگی؟ ہندوستان میں نیم کے جینیاتی مواد کے علاوہ ادرک اور ہلدی کے جینیاتی مواد پر بھی اسی طرح امریکی ادویات کی کمپنیوں نے کئی دفعہ قبضہ جمانے کی کوشش کی ہے۔

دنیا کی بڑی ادویات کی کمپنیاں امریکہ اور یورپ سے وابستہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پہاڑی علاقے کے لوگوں کی معلومات کو تحریر کرکے اس سے کئی بلین ڈالر کی منافع بخش ادویات یہ کمپنیاں تیار کرنے کی مالی اور تکنیکی صلاحیت رکھتی ہیں۔

اگر یو ایس ایڈ کے پروجیکٹس اپنے ملک کی منڈیوں کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں تو پھر ہماری عوام کو خود اپنے علم اور قدرتی وسائل جن میں مال مویشی اور جڑی بوٹیاں دونوں شامل ہیں، کی حفاظت کرنی ہوگی تاکہ ان سے قیمتی حیاتیاتی مواد چرا نہ لیا جائے۔ تھوڑے سے پیسوں اور گنتی کے روزگار کے عوض عوام کے قیمتی اثاثوں پر ڈاکے کے خلاف ہوشیار رہنا چاہیے۔

حوالہ جات کے لیے صفحہ نمبر 8 دیکھیں۔

کے لیے ''پائیدار ترقی'' کے لیے اہداف طے کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر مہم جوئی کر رہا ہے، تو یہ عوام اور عوامی گروہوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے لیے فیصلہ کریں کہ پائیدار ترقی کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقوام متحدہ بذات خود سرمایہ داری نظام کے ماتحت رہ کر پیش رفت کرتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے اہداف ریاست کی سطح پر لاگو کرنے میں سرمایہ دارانہ پیداواری اصول رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اس لیے کیا ان رکاوٹوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کی اس مہم جوئی میں شمولیت کی ضرورت ہے؟ اقوام متحدہ کی اس مہم کو ہم اگر نظر انداز کر بھی دیں تو کیا ماحولیاتی بحران ہماری زندگی کا حصہ نہیں ہے؟ کیا ہم اپنے ملک کی عوام اور دنیا کے تمام عوام کے لیے ایک بہتر طرز زندگی نہیں چاہتے؟ بھوک و افلاس سے کیا چھٹکارا حاصل نہیں کرنا چاہیے؟ اگر یہ سارے مقاصد ہمارے زندگی کے اہم مقاصد ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں بھی پائیدار ترقی کو بیان اور حاصل کرنے میں حصہ لینا چاہیے۔ مزدور کسان اپنے تعین کیے ہوئے پائیدار ترقی کے اہداف کس طرح منواتے ہیں، لاگو کرواتے ہیں، کے لیے مزید سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ پہلا قدم بہر حال یہی ہے کہ کسان مزدور یہ فیصلہ کریں کہ سماج کے اتنے اہم گروہ کے لیے پائیدار ترقی کیا ہے۔

کسان و مزدور طبقہ اور پائیدار ترقی

پائیدار ترقی کے حوالے سے دو اہم نقاط پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

1۔ پائیدار ترقی کیا ہے؟
2۔ پائیدار ترقی کے بنیادی ستون کیا ہیں؟

اس سے پہلے کے ہم پائیدار ترقی کو تفصیل سے بیان کریں، اس کے حصول کے لیے درکار بنیادی ستونوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسان راضی ہیں کہ پائیدار ترقی کی تعریف قدرتی وسائل کی بقا، موجودہ اور آنے والی نسلوں کی بقاء کے لیے لازم ہے تو سرمایہ داری میں قدرت کے استحصال کے خاتمے کی اشد ضرورت ہے۔ غذا وہ بنیادی انسانی ضرورت ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور قدرتی وسائل کے استعمال کے بغیر خوراک کا حصول ممکن نہیں۔ اس کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں تمام جاندار ایک دوسرے کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں چاہے وہ انسان ہوں، جانور ہوں، چرند پرند یا پھر پھل پھول جنگلات اور فصلیں۔ نہ صرف تنوع حیات ہماری غذائی ضروریات پورا کرتی ہے بلکہ انسانی زندگی کی کئی اور بنیادی ضروریات قدرتی وسائل سے پوری کی جاتی ہیں مثلاً کپاس یا پٹسن جن سے ہم کپڑے اور دیگر اشیاء بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ معدنیات، پانی اور زمین جیسے انتہائی اہم قدرتی وسائل بھی ہماری روز مرہ کی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ قدرتی وسائل کئی طرح کی مادی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ حیات (زندگی) برقرار رکھنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً درختوں کے بغیر صاف ہوا، سیلاب سے بچاؤ اور زمین کا ٹھہراؤ ممکن نہیں۔

پائیدار ترقی پر توجہ اور اس کے حصول کے لیے کاوشیں دراصل قدرت میں پائے جانے والے موجودہ بحران ہی کا نتیجہ ہیں۔ ہمیں بھرپور نظر ثانی کرنی پڑے گی کہ کیا پاکستان کا مزدور کسان تنوع حیات کو محفوظ کرنے کی حالت میں ہے؟ کیا پاکستان میں کسان اور مزدور اس وقت قدرتی اشیاء کے استعمال پر اختیار رکھتا ہے؟ کیا اس کے اختیار میں ہے کہ وہ زمین، پانی، سمندر، جنگلات اور تنوع حیات کے بیش بہا خزانوں کے استحصال کو روک سکے؟ اگر نہیں تو کیا پائیدار ترقی ممکن ہے؟

پائیدار ترقی کے بنیادی ستون

پائیدار ترقی کو بیان کرنے کی ضرورت کیونکہ ماحولیاتی بحران کی شدت اختیار کرتی ہوئی صورتحال کی وجہ سے پیش آئی، اس لیے ماحولیات خود بخود پائیدار ترقی کا ایک ستون بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کون سے بنیادی ستونوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے؟ عام طور سے بنیادی ستونوں میں سیاسی، معاشی اور سماجی و ماحولیاتی ستون شامل کیے جاتے ہیں۔

1۔ سیاسی ستون

پاکستان کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ دیہات سے وابستہ ہے۔ ہمارے کسان مزدور کی روزی قدرتی ذخائر سے جڑی ہوئی ہے، چاہے وہ مزدور کسان ہوں یا ماہی گیر یا چرواہے۔ یہ وہ محنت کش گروہ ہیں جن کی محنت کی وجہ سے پاکستان کی عوام خوراک حاصل کرتی ہے۔ یقیناً مزدور کسان کی پیداواری قوت کے بل پر نہ صرف ہمارے ملک بلکہ پوری دنیا کا نظام چلتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پیداواری طبقہ کو اگر پائیدار ترقی حاصل کرنی ہے تو اس کو مختلف حوالے سے ایک کلیدی کردار ادا کرنا پڑے گا۔

سیاسی ستون کو کیسے بیان کیا جائے گا؟ سیاست کا عام فہم مقصد سیاسی پارٹیوں کا حصہ بننا یا انتخابات میں حصہ لے کر ووٹ دینا ہے مگر یہ سیاست کا صرف ایک رخ ہے۔ سیاست میں اس لیے بھی حصہ لیا جاتا ہے کہ سماج کے مختلف گروہ اپنی مرضی کی طرز زندگی کو حاصل کرنے کے لیے فیصلہ سازی کریں اور ان پر عمل درآمد کے لیے اقدامات اٹھائیں۔ اگر عوام خصوصاً مزدور کسان اپنے لیے پائیدار ترقی کے اہم نکات کا فیصلہ کرتے ہیں تو ان فیصلوں کو کس طرح پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے گا؟ اس سوچ اور عمل کو سیاسی شعور کہا جاسکتا ہے۔ پائیدار ترقی کے لیے فیصلہ سازی ایک سیاسی مرحلہ ہے۔ جس کے کئی مراحل ہیں۔ پہلے تو مختلف پیداواری طبقوں کو اپنے حالات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ پاکستان کی تمام پیداوار یقیناً مزدور اور کسان طبقہ کی محنت کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے لیکن اگر زندگی کی آسودگیوں اور اسائشوں کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو پاکستان کی کل دولت اور اثاثہ بہت تھوڑے ہاتھوں میں ہے۔ ان میں امیر ترین اور سیاسی حوالے سے سب سے زیادہ طاقتور جاگیردار یا پھر سرمایہ دار

طبقہ ہے۔ ملک کی تقریباً آدھی زرعی زمین پر پاکستان کے بہت ہی تھوڑے جاگیردار گھرانوں کا پاکستان بننے سے لے کر آج تک قبضہ و اختیار ہے۔ اس کے علاوہ دولت جو کہ صنعت سے جڑی ہوئی ہے، وہ بھی تھوڑے سے گھرانوں کے پاس ہے۔ اکثر زمین اور صنعت پر اختیار رکھنے والے خاندان ایک ہی ہیں۔ بہرکیف دیہی آبادیاں تو جاگیرداری نظام کے شکنجے میں مکمل طور پر پسی ہوئی ہیں۔ اسی طرح شہری مزدور کی حقیقت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق شہری علاقوں میں کام کرنے والے شعبے میں مجموعی طور پر 15.25 ملین لوگ شامل ہیں، جن میں مزدور طبقہ 14.79 ملین ہے یعنی 96.9 فیصد عوام مزدور ہے۔[7] انہی ذرائع کے مطابق کل کام کرنے والے 35.54 ملین لوگوں میں دیہی مزدور 35.4 ملین ہیں یعنی 99.6 فیصد مزدور ہیں۔ واضح ہے کہ محنت کش طبقہ بھاری اکثریت میں ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے ملک کی کثیر عوام جو کہ محنت کش طبقہ پر مشتمل ہے، کیا خوش حال ہے؟ دیہی آبادیوں میں جائیں یا شہر کی بستیوں میں مزدور عوام بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور نظر آتی ہے۔ 07-2006 کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 22.3 فیصد عوام غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ سرکار اب ان اعداد و شمار پر نئی معلومات فراہم نہیں کر رہی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں غربت کے لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے عوام کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے، یہاں تک کہ 43 فیصد آبادی اس وقت غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔[8] 2010-2008 کے دورانیہ میں غذائی اشیاء، زرعی پیداواری اشیاء اور دیگر ضروریات زندگی کی اشیاء کی قیمتوں میں ایک طرف شدید اضافہ ہوا ہے اور دوسری طرف بیروزگاری میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا۔ جس سے ظاہر ہے کہ غربت میں کمی کے تو کوئی امکانات نہیں۔

ان حالات میں مزدور کسان طبقہ اپنی معاش کے حصول کے لیے کیا فیصلہ کرتا ہے؟ کیا اس کا مطالبہ مہنگائی میں کمی ہونا چاہیے یا پھر تنخواہ اور دیہاڑی میں اضافہ ہے، مزدور کسان عوام کو پائیدار ترقی کی طرف لے جائے گا؟ یا پھر پائیدار ترقی کو حاصل کرنے کے لیے مطالبات کا کوئی اور رخ ہونا چاہیے؟ کیا صرف دیہاڑی میں اضافہ مانگنے یا پیداواری اشیاء کی قیمتوں کو کم کرنے سے پائیدار معاش ممکن ہے؟ ہمارے پیداواری رشتے تو ان مطالبات سے نہیں بدلتے۔ زمین و صنعت کا مالک جاگیردار اور سرمایہ دار ہی رہے گا۔ اس کے علاوہ روزگار حاصل کرنے کے کیا پائیدار طریقے ممکن ہیں؟ کیا روزگار یہ تعین نہیں کرتا کہ ہماری زندگیوں میں سکون اور اطمینان ہو؟ ہم بہتر غذا، صحت و تعلیم حاصل کر سکیں؟ کیا ہم ایک ایسے معاشی نظام کا تعین کریں جس میں بنیادی ضروریات تمام افراد کو یکساں طور پر حاصل ہوں؟ نہ امارت اور نہ غربت کی انتہا ہو۔ عوامی گروہ معاشی و سیاسی شعور کی بنیاد پر طریقہ پیداوار اور پیداواری وسائل کی تقسیم اور اختیار کے لیے فیصلہ سازی کریں۔ جب تک کہ معاشی ستون کی بنیاد عوامی بھلائی پر مبنی نہیں ہوگی پائیدار ترقی کا حصول ناممکن ہے۔ اگر پاکستانی عوام کا سب سے بڑا حصہ مزدور کسان ہیں تو پھر فیصلہ سازی میں سب سے بڑا حصہ اس طبقے کا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن آج سرمایہ داری اور نیم جاگیرداری نظام رائج ہے تو قطعاً یہ نظام فیصلہ سازی کے اختیارات مزدور طبقہ کو دینے پر راضی نہیں ہوگا کیونکہ اس کی محنت کے نتیجہ میں تو یہ طبقہ پرتعیش زندگی گزار رہا ہے۔ جب تک مزدور کسان سیاسی فیصلہ سازی کا حق استعمال نہیں کرے گا پائیدار ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

2۔ معاشی ستون

پائیدار ترقی کے حصول کے لیے دوسرا ستون معاشی ہے۔ معاش دراصل پیداوار سے جڑا ہوا ہے۔ جیسے ہی انسان دنیا میں آتا ہے غذا مانگتا ہے۔ جس کا تعلق پیداوار سے ہے یعنی صرف / استعمال اور پیداوار آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور اسی دائرے کے ارد گرد پیداواری نظام چلتا ہے۔ اس وقت کا پیداواری نظام سرمایہ داری ہے۔ یہ نکتہ پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ سرمایہ داری نظام منافع کے حصول کو لازم بناتے ہوئے کبھی بھی مزدوروں کی کثیر آبادی کو بہتر معاش یا دوسرے لفظوں میں پائیدار معاش نہیں فراہم کر سکتا۔ پائیدار معاش ایسا طریقہ پیداوار ہے جس کے ذریعہ مزدور سرمایہ دار کا محکوم نہیں بلکہ خود مختار ہوجائے۔ مثلاً اگر پاکستان میں زمینوں کا بٹوارہ ہو جائے تو کسان مزدور خود مختار ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر ریاست صنعت کو اپنے اختیار میں لے کر نجی ملکیت کو ختم کرتے ہوئے پیداوار اپنے ہاتھ میں لے لے تو مزدور کی معاش کو پائیدار بنایا جاسکتا ہے لیکن سرمایہ دار ایسا نہیں ہونے دیتا۔ کیونکہ اس سے نہ صرف اس کے منافع میں دراڑیں پڑیں گی بلکہ اس کے لیے ایک اور پیداواری مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔ اگر مزدور خود مختار ہوجائے گا تو سرمایہ دار کے لیے مزدوری کون کرے گا؟ اگر نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا تو پھر سرمایہ دار دولت کیسے اکٹھی کرے گا؟ اسی لیے معاشی اور سیاسی ستون آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ سیاسی شعور مزدور کو اپنے ایک بہتر ذریعہ معاش کے لیے قدم بڑھانے کا راستہ دیکھاتا ہے۔ معاشی شعور مزدور کے لیے سوال اٹھاتا ہے کہ کیا وہ ہمیشہ طبقاتی فرق کی چکی میں پس کر دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے محکومی کی نظر ہوجائے گا؟ یا پھر پائیدار معاش کے لیے مزاحمت و جدوجہد کے راستوں پر چلنے کو ترجیح دے گا۔

3۔ سماجی اور ماحولیاتی ستون

معاشرتی اور ماحولیاتی ستون بھی پائیدار ترقی کی تعبیر کے لیے اہم ترین ہیں۔ یقیناً سماجی شعور معاشی شعور سے جڑا ہوا ہے۔ جب تک کہ معاشی نظام منصفانہ اور مساویانہ اصولوں کی بنیاد پر نہیں مرتب کیا جائے گا سماجی ستون کمزور رہے گا۔ سماج میں امن و انصاف اسی وقت ممکن ہے کہ جب عوام کو صاف ستھری جسمانی ضرورت کی بنیاد پر غذا حاصل ہو۔ جب عوام کے ذہنی و نشو نما کے لیے، آبادیوں کی ترقی کے لیے، باشعور تدریسی اداروں کا انتظام ہو، جہاں روزانہ زندگی گزارنے کے لیے دیگر سہولیات کی فراہمی ہو اور جہاں معاشرے میں ذات، مذہب، جنس، رنگ و نسل کی بنیاد پر تفریق نہ

ہو۔ پر امن، پر سکون آبادیوں کا قیام اسی وقت ممکن ہیں جب عوام کے پاس ان بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسائل بھی موجود ہوں اور ان کو استعمال کرنے کے لیے فیصلہ سازی کا حق بھی۔ یہ تمام وسائل ایک طرف بہتر معاش سے جڑے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ماحولیاتی نظام سے۔ جیسے کہ شروع میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ کرہ ارض اس وقت شدید ماحولیاتی بحران کی زد میں ہے۔ اگر ہم صرف پاکستان ہی کی مثال لیں تو پچھلے 20 سال کے دوران پے در پے ملک بڑے بڑے سیلابوں، سیلابی اور طوفانی بارشوں کے علاوہ خشک سالی، سمندری طوفانوں اور زلزلے کا شکار رہا ہے۔ ان آفات کا شدید اثر بڑے پیمانے پر براہ راست کسان آبادیوں اور مزدور بستیوں پر پڑا ہے۔ ایک طرف موسمی بحران زرعی زمینوں کو اجاڑ دیتا ہے اور دوسری طرف لاکھوں افراد کو بے گھر کردیتا ہے۔ اس کے علاوہ معاش کے دیگر سلسلے بھی بند ہوجاتے ہیں۔ ان حالات میں معاشرے کے لیے نہ روز مرہ کی زندگی بچتی ہے، نہ اسکول اور تعلیم کی سہولتیں اور نہ ہی امن امان۔ ماحولیاتی ستون دراصل ایک ایسا ستون ہے جو کہ سماجی شعور کے حصول سے مضبوط ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ماحولیات میں پائے جانے والے بیش بہا ذخائر کی حفاظت باشعور آبادیوں کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ یقیناً قدرتی وسائل و اثاثے اسی وقت محفوظ ہوسکتے ہیں جب معاشرے میں معاشی اور سیاسی ستون انصاف اور عوامی رائے کی بنیاد پر کھڑے کیے جائیں۔

ماحولیاتی بحران کا سارا تعلق طریقہ پیداوار سے ہے۔ ماحولیاتی بحران سے نمٹنے کے لیے موجودہ طریقہ پیداوار کو بدلنا ہوگا۔ قدرت کی ان گنت نعمتوں کی بقاء جس سے کل حیاتیات اور زندگی جڑی ہوئی ہے کا دارومدار اب سماجی، ماحولیاتی، سیاسی اور معاشی شعور سے ہے۔ مثال کے طور پر ماہی گیر مچھلی پکڑنے جاتے ہیں تو دریا و سمندر میں اب مچھلی نہیں ملتی۔ بڑے بڑے ٹرالرز نے ماہی وسائل کا اس بے دردی سے استحصال کیا ہے کہ دنیا میں مچھلیوں کی آبادیاں کئی علاقوں سے ختم ہوچکی ہیں اور کئی مقامات سے ختم ہونے والی ہیں۔ چھوٹے ماہی گیر ایک طرف معاش سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں تو دوسری طرف غذا سے۔ ماہی گیر تو لاکھوں برس سے تھے اور ان قدرتی وسائل کو بہت سنبھال کر استعمال کرتے تھے لیکن 100 سال سے کم عرصے میں سرمایہ داری نے دنیا کے بڑے بڑے بر آعظم خالی کردیے ہیں۔ ماہی گیروں کو فیصلہ کرنا ہے کہ کیا وہ اپنی اور آنے والی نسلوں کے ذریعہ معاش و غذا کے تحفظ کا ذمہ اٹھانے کو تیار ہیں؟ کیا تنوع حیات کی بقاء ان کی بھی ذمہ داری ہے؟ یا پھر اس معاشی ترقی کے نام پر اس قدر بیش بہا خزانہ کو لٹ جانے دیں گے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو اس زمانے کے بعد اگلی صدیوں میں قدم رکھنا ہے تو ضروری ہے انسان پائیدار ترقی کے حصول کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے سماج میں شعور کے استعمال سے پیداواری نظام میں بنیادی تبدیلیاں لائے جس کے ذریعے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ماحولیاتی انصاف ممکن ہو۔

پاکستان میں سیاسی ستون فی الوقت کن بنیادوں پر کھڑا ہوا ہے؟ فیصلہ سازی کن طاقتوں کے پاس ہے؟ اس میں کوئی ابہام نہیں کہ پاکستان کی اشرافیہ کی شکلیں وہی ہیں جو کہ 1947 سے لے کر آج تک اقتدار میں رہی ہیں۔ ان میں جاگیردار قوتیں، سرمایہ دار قوتیں اور فوج کا کردار ہے۔ ان تینوں طاقتوں نے پاکستان کی ہر معاشی پالیسی سازی پر مکمل اختیار قائم رکھا ہے۔

خوراک کی خودمختاری: پائیدار زراعت

پاکستان اور دنیا کے کئی خطوں سے کسان اور ماہی گیر آبادیوں نے اپنے لیے پے در پے آنے والے بحرانوں سے (چاہے وہ غذائی بحران ہو یا ماحولیاتی بحران) نمٹنے کے لیے ایک نئے طرز معاش کی نشاندہی شروع کردی ہے، جس کو خوراک کی خودمختاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تیسری دنیا کے چھوٹے اور بے زمین کسانوں نے سامراج کی یلغار سے لڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے لیے پائیدار معاش کا راستہ پائیدار زراعت میں ڈھونڈ لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سرکار کی گزارش کہ کسان و مزدور طبقہ اپنے لیے پائیدار ترقی بیان کریں سے کئی سال پہلے ہی یہ طبقہ چوکنا ہو چکا تھا۔

کسان آبادیوں کے لیے پائیدار ترقی پائیدار زراعت کے اصولوں کو لاگو کرکے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ پائیدار زراعت خوراک کی خودمختاری کا ایک لازم حصہ ہے۔ خوراک کی خودمختاری جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کے اصولوں سے مختلف ہے۔ اس کے اہم اصولوں میں پیداواری اشیاء پر کسان و مزدور کا مکمل اختیار ہے۔ ان اشیا میں زمین، بیج، جنگلات، آبپاشی کے لیے پانی اور دیگر پیداواری اشیاء شامل ہیں۔

خوراک کی خودمختاری کسان و مزدور کے لیے نہ صرف روزگار کو یقینی بناتی ہے بلکہ بہتر روزگار جس کے ذریعہ کسان آبادیاں زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے پر زور دیتی ہے۔

خوراک کی خودمختاری غذا و زرعی پیداواری طریقہ کے لیے اصول وضع کرتی ہے۔ یہ اصول پائیدار زراعت پر مبنی ہیں جو کہ قدرتی روایتی کھیتی باڑی کی بنیاد پر زرعی پیداوار کو فروغ دیتا ہے۔ اس طرز پیداوار میں مقامی بیجوں، اصلی کھاد یعنی گوبر یا سبز کھاد کے ذریعہ کھیتی باڑی کے طریقے پر زور دیا گیا ہے۔ اس اصول کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ بڑھتے ہوئے ماحولیاتی بحران سے نمٹنے کے لیے صرف روایتی کھیتی باڑی کسان کو آفات سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتی ہے۔ دوسری طرف کسان کو اگر سرمایہ داری اور سامراجیت کے چنگل سے نکلنا ہے تو پائیدار ترقی کے حصول کو ممکن بنانا ہے اور یہ صرف پائیدار زراعت ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ اس طریقہ زراعت میں کسان منڈی کا محتاج نہیں رہتا، کیونکہ وہ زہریلی ادویات، نا ہی کیمیائی کھاد اور نا ہی محتاجی والی بیجوں پر انحصار ہوتا ہے۔ ایک طرف ماحول صاف ستھرا ہوجائے گا دوسری طرف کسان کو قرض کی دلدل سے نجات مل جائے گی اور نتیجے میں پائیدار روزگار ممکن ہوسکے گا۔

خوراک کی خود مختاری انسانی حقوق کے اصولوں پر مبنی ہے۔ پائیدار ترقی انسانی اور مشترکہ حقوق حاصل کیے بغیر ممکن نہیں۔ مشترکہ حقوق ہی کسان آبادیوں کا محور ہیں۔ مثلاً بیج پر کسی ایک انسان کا حق نہیں ہوسکتا۔ تنوع حیات میں بہت وسعت ہے اور اس خزانے پر دنیا کی ان کسان آبادیوں ہی کا مشترکہ حق ہے جنہوں نے صدیوں سے بیج کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا۔ آج مقامی بیجوں کے جینیاتی مواد پر سرمایہ دار کمپنیاں اپنا حق منوا رہی ہیں جو تنوع حیات کی تباہی کا یقینی راستہ ہے۔ اگر پائیدار ترقی کے لیے ماحولیاتی ستون کو مضبوط کرنا ہے تو ہر صورت میں قدرتی اشیا کو سرمایہ دار کی منافع خور منڈی پر مبنی پیداواری نظام سے الگ کرنا پڑے گا۔

خوراک کی خود مختاری پائیدار ترقی کے لیے ایک نہایت اہم اصول اپنے اندر رکھتی ہے اور وہ ہے فیصلہ سازی کا حق۔ کسان آبادیوں کا اپنے معاش اور ماحولیاتی تحفظ کے لیے مزاحمت کے حق کو خوراک کی خود مختاری واضح کرتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر پائیدار ترقی کا حصول نہ صرف اس کرہ ارض بلکہ انسانیت کے بقاء کا ضامن ہے تو پھر فیصلہ سازی عوام و کسان کو اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی۔ یقیناً اس کے لیے مزاحمت اور جدوجہد کے راستے پر چلنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔

جس ملک میں مجموعی آبادی کا تقریباً 70 فیصد حصہ دیہی آبادیوں پر مشتمل ہو اور

حوالہ جات

1. World Commission on Environment & Development. "*Our common future."* Oxford University Press, 1987, p.43.
2. Sayed, Ali Hasnain. "*Climate change and its realities for Pakistan,*" Paper No. 288. World Wide Fund. Symposium on changing environmental pattern and its impact with special focus on Pakistan." Pakistan Engineering Congress, 2011.
3. The News. "*Pakistan among top 10 states worst hit by climate change,*" April 09, 2013, accessed from http://www.thenews.com.pk/Todays-News-6-170225-Pakistan-among-top-10-states-worst-hit-by-climate-change.
4. Oxford Dictionaries. "*Definition of capitalism,*" accessed from http://oxforddictionaries.com/definition/english/capitalism.
5. Nafziger, E. Wayne. "*The economics of developing countries.*" Prentice Hall, 1990, p.40.
6. UN Economic and Social Commission for Asia and the Pacific. "*Economic and Social Survey of Asia and the Pacific 2012: Year-end update.*" ESCAP, 2012 Thailand, accessed from http://www.unescap.org/pdd/publications/yearend2012/Year-End-Update-2012.pdf.
7. Government of Pakistan. "*Economic Survey of Pakistan, 2010-11.*" Economic Advisor's Wing, Finance Division, Government of Pakistan, Islamabad, p.160, accessed from http://www.infopak.gov.pk/EconomicSurvey/12-Population.pdf.
8. Tirmizi, Farooq. "*Economic survey 2010: has the real poverty rate hit 43%?*" Express Tribune, June 3, 2011, accessed from http://tribune.com.pk/story/181361/economic-survey-2010-11-has-the-real-poverty-rate-hit-43/.

پاکستان میں زرعی سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے پالیسی سازی*

پاکستان کارپوریٹ ایگریکلچر فارمنگ (Corporate Agriculture Farming/CAF) کے مطابق سرمایہ کاری کے نمایاں نکات درج ذیل ہیں:

- غیر ملکی سرمایہ کاری پر سو فیصد سرمائے (Equity) کو ملک سے باہر لے جانے کی اجازت کیس ٹو کیس کی بنیاد پر دی جائے گی۔
- زمین کے حصول کے لیے کوئی حد مقرر نہیں۔ مجوزہ کارپوریٹ فارم کی حد کا تعین کرنے کا اختیار سرمایہ کار کو ہے۔
- نیلامی کے ذریعہ سرکاری زمین 50 سال کے عرصہ کے لیے خرید سکتے ہیں یا لیز پر لے سکتے ہیں جو کہ مزید 49 سال تک بڑھائی جاسکتی ہے۔
- تمام بینک اور مالیاتی ادارے کارپوریٹ ایگریکلچر فارمنگ کے لیے الگ سے رقم مختص کریں گے۔
- صوبوں پر جو زرعی انکم ٹیکس لاگو ہوتی ہے وہی کارپوریٹ ایگریکلچر فارمز پر بھی لاگو ہوگی۔
- زرعی آلات اور مشینوں کا کسٹم ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس سے استثنیٰ۔
- کارپوریٹ ایگریکلچر فارمنگ کے لیے زمین کی منتقلی پر ڈیوٹی کی ادائیگی پر چھوٹ۔
- ٹیکس کی چھوٹ؛ پہلے مرحلے میں مشینوں کی نصف فیصد قیمت پر ڈیپری سیشن الاؤنس۔
- کارپوریٹ زرعی فارم سے حاصل کیے گئے منافع پر کسی قسم کا ٹیکس لاگو نہیں ہوگا۔
- زرعی آمدنی کو دوسرے ذرائع سے حاصل کی گئی آمدنی پر ترجیح دی جائے گی۔

* Food and Agricultural Organization (FAO). "*Foreign agricultural investment profile: Pakistan.*" FAO Investment Policy Support, FAO, 2011, pp.17-18, accessed from http://www.fao.org/fileadmin/user_upload/tcsp/docs/PAKISTAN_Country_Profile.pdf.

تحفظ خوراک اور غذائیت کی قومی پالیسی: ایک تنقیدی جائزہ

تحریر: ولی حیدر

زراعت جن کا سب سے اہم ذریعہ معاش ہو، عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس ملک کو چلانے والے حکمران اپنی ترجیحات میں ضرور اسی اہم عنصر کو مدنظر رکھیں گے۔ مگر جب ہم پاکستانی حکمرانوں کی ترجیحات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دیہی آبادی، خاص طور پر چھوٹے اور بے زمین کسان، ان کی مرکز نگاہ نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آزادی کے فوراً بعد ہاری رپورٹ میں ایم ایم مسعود (ایک سرکاری بیوروکریٹ) کو اختلافی نوٹ لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی جس میں انہوں نے بڑی بڑی جاگیروں کو بے زمین لوگوں میں تقسیم کرنے کی تجویز دی تھی۔ مگر اس وقت کے حکمران اشرافیہ نے ایک ایسی پالیسی کو منظور کرلیا جس کے تحت جاگیرداری مزید مضبوط ہوئی اور پسے ہوئے طبقات خاص طور پر کسان مزدور استحصال کا شکار ہوئے اور آج تک ہوتے چلے آرہے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی 1952 کے زرعی قوانین، 1959 اور 1974 کی زرعی اصلاحات سے مٹھی بھر اشرافیہ کو ہی فائدہ پہنچایا گیا اور ہمارے سماج کی ابتری کی ایک بڑی وجہ، جاگیرادری، اپنی جگہ چٹان بنی کھڑی رہی۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ زرعی اصلاحات کے نتیجہ میں جنوبی کوریا، بنگلہ دیش اور بھارت میں جاگیرداری کا خاتمہ ممکن ہوا، جس کے انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ آج یہ ممالک زندگی کے تمام شعبوں خاص طور پر تعلیم، صحت اور معیشت میں پاکستان سے کئی گنا آگے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ اس کے برعکس رہی ہے کہ ماضی اور حال دونوں میں حکمرانوں نے ایسی زرعی اور معاشی پالیسیاں ترتیب دیں جس کے نتیجہ میں صرف جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو ہی فائدہ نصیب ہوا مثلاً سبز انقلاب سے لے کر کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس اور درمیان میں عالمی اداروں کی مسلط کردہ اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پالیسیاں تمام کی تمام کسانوں اور مزدوروں کے لیے ایک گہری کھائی ثابت ہوئیں جس سے محروم طبقات آج تک نہیں نکل پائے۔

حکومت پاکستان کی حالیہ مرتب کردہ خوراک اور غذائیت کے تحفظ کی پالیسی1 بھی ایسے ہی سلسلوں کی ایک کڑی نظر آتی ہے۔ بظاہر اس پالیسی میں کسان دوست نکات موجود ہیں مگر بغور مطالعہ کیا جائے تو کئی سنگین مسائل سامنے آتے ہیں جو کہ ہماری کسان آبادیوں کے لیے زہر قاتل ہیں۔ اس مضمون میں ہم اس پالیسی کے چیدہ چیدہ نکات کو آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں تاکہ آگہی ہو کہ پاکستان کا حکمران طبقہ 21 ویں صدی میں اپنی کثیر آبادیوں کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے کس طرح عالمی کارپوریٹ ایجنڈے کو آگے بڑھا رہا ہے۔ قومی تحفظ خوراک اور غذائیت کی پالیسی دراصل پانچ مختلف حصوں میں ترتیب دی گئی ہے جنہیں ابواب (Chapters) کا نام دیا گیا ہے۔ ان ابواب میں جن بنیادی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلے باب میں اس پالیسی کا تعارف اور آئینی حوالہ دیا گیا ہے۔
دوسرے باب میں حالات کا جائزہ اور مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔
تیسرے باب میں رہنمائی کے لیے اصول وضع کیے گئے ہیں۔
چوتھے باب میں پالیسی کے اہداف بیان کیے گئے ہیں۔
پانچویں باب میں پالیسی کے لیے ادارتی انتظام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

I۔ پہلا باب: تعارف اور آئینی حوالے

بنیادی نکات

اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ مجوزہ تحفظ خوراک اور غذائیت کی پالیسی چار مختلف زاویوں کے گرد گھومتی ہے جو درج ذیل ہیں:

(i) خوراک کی دستیابی (پیداوار کے ذرائع، ذخیرہ، درآمدات اور امداد کے ذریعہ)۔
(ii) خوراک تک رسائی (جسمانی و معاشی ذرائع سے معیاری خوراک تک رسائی)۔
(iii) خوراک کا استعمال (خوراک کا مناسب استعمال)۔
(iv) پائیداری (پائیدار بنیادوں پر خوراک کا دیرپا تحفظ)۔

مجوزہ پالیسی کو مضبوط کرنے کے لیے پاکستان کے آئین میں موجود آرٹیکل 38(b) کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ آرٹیکل ہر فرد کے لیے ضرورت کے مطابق غذائیت سے بھرپور صاف ستھری غذا جو کہ اس کو متحرک اور صحت مند زندگی گزارنے میں مدد فراہم کرے کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے آئین کا آرٹیکل 38(d) تمام شہریوں کے لیے زندگی کے بنیادی سہولیات کی فراہمی بشمول غذا کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ پالیسی میں یہ تجویز بھی دی گئی ہے کہ پارلیمنٹ تحفظ خوراک کی قانون سازی کرتے ہوئے ''خوراک کے حق'' کو بطور بنیادی حق تسلیم کرے۔

II۔ دوسرا باب: حالات کا جائزہ اور رکاوٹیں

بنیادی نکات

اس باب میں پاکستان کی تحفظ خوراک کی صورتحال کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

زرعی پیداوار کی صورتحال کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ خوراک کی فراہمی میں پاکستان نے خاطر خواہ پیش رفت کی ہے۔ خوراک کی فصلیں مثلاً گندم، چاول اور دالوں کی فی کس دستیابی میں پچھلے پندرہ سالوں میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ زیادہ مالی حیثیت رکھنے والی (high value) زرعی مصنوعات مثلاً پھل، دودھ اور گوشت کی پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ دیکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ کھیت کی سطح پر بہتر پیداواری سرگرمیاں، فی کس آمدنی میں اضافہ، دیہی وشہری رابطہ اور منڈی کے انتظامات میں بہتری سمجھی جاتی ہے۔

اس طرح کھپت کی مختلف شکلوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تیار شدہ کھانوں اور غیر تیار شدہ کھانوں کے استعمال کے فرق میں اضافہ ہوا ہے۔ تجارت کے شعبہ میں گو کہ دالوں اور سیرل (تیار شدہ خوراک) کی پیداوار میں تین سے پانچ گنا اضافہ ہوا ہے، یہ حقیقت بھی ہے کہ ملک کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے گندم، دال اور خوردنی تیل کی درآمدات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ آبادی کی موجودہ بڑھتی ہوئی شرح کو مدنظر رکھتے ہوئے غذائی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس اضافی پیداوار کو برآمد کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ پاکستان پہلے ہی چاول برآمد کرنے والا ایک اہم ملک ہے۔ چونکہ زرعی رقبہ میں اضافے کے کم امکانات ہیں اس لیے فصلوں کے بہتر انتظام کے طریقوں کے ذریعہ فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ممکن بنایا جائے گا۔

پالیسی میں پاکستان میں مائیکرو نیوٹرینٹ کی کمی پر بہت تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور اسے ''چھپی ہوئی بھوک'' سے تشبیہہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح مائیکرو نیوٹرینٹ کی کمی کی وجہ سے ماں کی صحت اثر انداز ہوتی ہے خاص طور پر زنک اور آئیوڈین کی وجہ سے۔ مائیکرو نیوٹرینٹ کی کمی سے قوت مدافعت، نشوونما اور ذہنی ارتقاء میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ پاکستان میں وافر مقدار میں غذا ہونے کے باوجود بہت بڑی آبادی خاص طور پر بچے اور عورتیں غذائیت سے بھرپور متناسب غذا تک رسائی سے محروم ہیں۔

مسائل کا ذکر کرتے ہوئے پالیسی میں بیان کیا گیا ہے کہ:

- نامناسب زرعی معلومات، مشینری اور کھیتی باڑی کے طریقہ کار کی وجہ سے بہترین طریقہ کار (Best Practice) کے تحت زراعت کرنے والے اور اوسط درجہ کی پیداوار کرنے والے کے درمیان فرق بڑھ رہا ہے۔
- غیر موثر اور غیر مناسب طریقہ کٹائی، زخیرہ اندوزی، عمل کاری (processing) اور نامناسب دیکھ بھال کی وجہ سے خوراک کا زیاں ہونا۔
- نامناسب معاشی پالیسیوں بشمول قیمت کا تعین، مارکیٹنگ، محصولات کی پالیسی اور ضرورت سے کم زرعی پیداواری اشیاء۔
- زمین کی زرخیزی میں کمی۔
- بارانی علاقوں میں غیر متوقع بارش اور موسمی تبدیلی۔
- اچھی اور مناسب زمین اور پانی کی دستیابی میں کمی۔
- چھوٹے رقبہ پر کاشت کرنے والوں کی زیادہ تعداد۔
- پیداواری ذرائع (مثلاً مصنوعی کھاد، کیڑے مار ادویات) کے کم استعمال کے نتیجہ میں جانوروں اور فصل کی کم پیداوار۔
- ناگہانی آفات یا ایسی صورتحال جو کہ خوراک کی ترسیل میں رکاوٹ پیدا کر سکے کی پیش گوئی، تجزیہ اور نمٹنے کی صلاحیت میں کمی۔
- ناکافی معاشی ترقی جس کے نتیجہ میں ملازمت کے مواقع میں کمی اور معاشی طور پر کارآمد ہونے پر مادی فوائد میں کمی۔
- قومی معاشی پالیسیوں کے منفی اثرات، ملازمت کی تربیت میں کمی اور قرضہ حاصل کرنے کے طریقوں کا فقدان۔

III۔ تیسرا باب: رہنما اصول

بنیادی نکات

اس باب میں بتایا گیا ہے کہ جہاں پاکستان میں ضرورت کے مطابق خوراک موجود ہے چاہے وہ قومی پیداوار کے ذریعہ ہو یا پھر درآمدات کی صورت، وہاں بڑے پیمانے پر ایسے افراد ہیں جو بھوک اور غذائی کمی کا شکار ہیں کیونکہ وہ خوراک خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے خوراک اور غذائیت کی پالیسی کچھ بنیادی اصولوں پر وضع کی گئی ہے جو درجہ ذیل ہیں:

- سب کے لیے مساویانہ سطح پر ضرورت کے مطابق خوراک تک رسائی تحفظ خوراک امن اور خوشحالی کے لیے لازمی شرط ہے۔ تمام لوگ چاہے وہ امیر ہوں یا غریب معاشرے میں بڑے پیمانے پر تحفظ خوراک سے مستفید ہوسکتے ہیں۔
- خوراک پر حق - ضرورت کے مطابق خوراک تک رسائی، بنیادی انسانی حق ہے۔
- کثیر الجہتی شعبہ جات کے تحت شراکت داری۔
- صنفی برابری اور اختیار۔
- زرعی اشیاء پر مراعات۔
- آزاد منڈی اور مقابلہ سازی۔
- مضبوط سیاسی سربراہی اور لگن۔
- پائیدار معاشی ترقی۔
- غریب ترین افراد تک پہنچ۔
- باہمی اور مربوط ردعمل۔
- رابطہ کاری۔

- پائیدار اثرات کے لیے نگرانی۔
- شفافیت۔
- صلاحیت میں اضافہ۔
- سماجی تحفظ۔
- خوراک کے امدادی پروگرام۔
- آپس میں جڑے ہوئے مسائل۔
- بین الاقوامی اداروں کے ساتھ عہد کی پاسداری۔

IV۔ چوتھا باب: پالیسی کے مقاصد

بنیادی نکات

تحفظ خوراک اور غذائیت کی پالیسی (2015-2013)، کے طویل مدتی مقاصد درجہ ذیل ہیں:

- تمام پاکستانیوں کے لیے تمام وقت ایک فعال صحت مند زندگی کے لیے پائیدار بنیادوں پر ضرورت کے مطابق غذائیت سے بھرپور غذا تک جسمانی اور معاشی طور پر رسائی۔
- ماحول دوست اور پائیدار بنیادوں پر خوراک کی پیداوار اور تقسیم۔
- خوراک کی پیداوار اور کھپت ایسے سماجی اقدار کے تحت ہو جو کہ منصفانہ، مساویانہ، اخلاقی اور انسانی عظمت کے بنیادوں پر ہو۔
- 2030 تک موجودہ عدم تحفظ خوراک میں کمی، خاص طور پر غذا میں کمی کے شکار افراد میں نصف فیصد تک کمی۔
- 2050 تک غربت اور عدم تحفظ خوراک کا خاتمہ۔
- قومی تحفظ خوراک اور غذائیت کے حصول کے لیے وفاقی، صوبائی وزارتوں/ محکموں، نجی شعبہ، سماجی گروہ اور دیگر شراکت داروں کے درمیان بات چیت کے مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کرنا۔

پالیسی مخصوص مقاصد کے تحت قومی تحفظ خوراک اور تحقیق کی وزارت، محکموں، ترقیاتی شراکت داروں، سول سوسائٹی اور نجی شعبوں سمیت، وفاقی اور صوبائی حکام کو شامل کرنے کے عمل کو آسان بنائے گی۔ اس کے علاوہ پروگراموں کو تیار کرنا اور تحفظ خوراک و غذائیت کی نگرانی کے لیے طریقہ کار وضع کرنا بھی اس کے مقاصد میں شامل ہیں۔

مستقل خوراک کی دستیابی: تمام اوقات میں تمام پاکستانیوں کے لیے پیداوار، خریداری اور تجارت کے ذریعہ، ضرورت کے مطابق صحت مند خوراک کی مختلف اقسام کی دستیابی کو یقینی بنایا جائے گا۔ اس پالیسی میں غذا کی دستیابی سے مراد ہے کہ خوراک ضرورت کے مطابق مناسب مقدار میں ہو اور معیار کے مطابق ہو جو کہ مقامی پیداوار اور درآمد کے ذریعہ ترسیل کی جائے۔

پائیدار بنیادوں پر خوراک کی موجودگی: ضرورت کے مطابق صحت مند اور مختلف اقسام کی خوراک کی دستیابی کو تمام اوقات میں تمام پاکستانیوں کے لیے پیداوار، خریداری اور تجارت کے ذریعہ یقینی بنایا جائے گا۔ اس پالیسی میں خوراک کی دستیابی یقینی بنائی گئی ہے چاہے وہ ملکی پیداوار کے ذریعہ ہو یا درآمد کے ذریعہ۔

خوراک کی فراہمی پر جو عوامل اثر انداز ہوتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

i۔ زمین اور دیگر پیداوار بڑھانے والے ذرائع (مثلاً کھاد، کیمیائی دوا اور پانی) کے ساتھ ساتھ فصل کا بہتر انتظام۔

ii۔ مجموعی عوامل افادیت (ٹوٹل فیکٹر پروڈیکٹیوٹی/TFP) میں اضافہ۔ اس سے مراد مجموعی پیداوار میں بہتری یا کمی ہے جو کہ پیداواری ذریعوں اور ٹیکنالوجی میں تبدیلیوں سے لائی جاتی ہے۔ ان میں شامل ہیں اعلیٰ درجہ کی تحقیق اور ترقی، بہتر تعمیراتی ڈھانچہ، رقوم کی دستیابی وغیرہ۔

iii۔ مخصوص اداروں میں تبدیلی: تیسرے اہم عمل میں شامل ہے۔ زراعت سے جڑے اہم اداروں کی تبدیلی (جن میں شامل ہیں زراعت اور اس سے جڑی منسٹریاں اور ادارے، زرعی تحقیق اور تعلیم، ایکسٹینشن، کریڈٹ [رقوم] اور مارکیٹینگ وغیرہ) اور اس کے ساتھ مضبوط سیاسی تعاون۔

خوراک تک رسائی: اس سے مراد ہے کہ کیا افرادی اور گھر کی سطح پر یا مجموعی طور پر پوری قوم کو ضرورت کے مطابق خوراک تک رسائی موجود ہے؟ خوراک تک رسائی کی معلومات غذائی تحفظ پر رسائی کی مجموعی صورتحال کے اثر کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔ انفرادی طور پر مناسب وسائل سے خوراک حاصل کرنے کے لیے انفرادی طور پر وسائل تک رسائی۔ جس کا مقصد ہوگا تمام اوقات میں ضرورت کے مطابق سماجی، معاشی اور جسمانی رسائی کے ذریعہ تحفظ خوراک کا حصول۔

خوراک کا استعمال اور غذائیت: تحفظ خوراک کے دو اہم رخ خوراک کا استعمال اور غذائیت ہیں۔ ان سے مراد ہے کہ خوراک صحیح استعمال ہورہی ہے، بنانے (processing) اور ذخیرہ اندوزی کے بہتر طریقہ کار استعمال کیے جارہے ہیں، بچوں کی صحت اور غذائیت کے حوالے سے مناسب معلومات ہیں اور استعمال میں لائی جارہی ہیں اور مناسب صحت و صفائی کی سہولیات کی موجودگی ہے۔

تحفظ خوراک سے مراد: ایک آبادی، گھرانہ یا فرد کو تمام وقت کے لیے ضرورت کے مطابق خوراک تک رسائی یقینی ہو۔ انہیں کسی معاشی اور موسمی بحران کی وجہ سے خوراک کے حصول میں مشکل کا خدشہ یا خطرہ نہ ہو۔

خوراک اور غذائیت کی معلومات کا نظام، نگرانی اور جانچ: خوراک اور غذائیت کے تحفظ کی معلومات اس قومی ہدف کے حصول کے لیے ایک لازمی جز ہے جو کہ غذائی عدم تحفظ اور خوراک میں کمی کو کم کرتا ہے۔ اس معلومات سے فیصلہ سازی، پالیسی اور پروگرام متعارف کرنے میں مدد ملتی ہے۔

۷۔ پانچواں باب: ادارتی انتظامات

بنیادی نکات

اس پالیسی دستاویز کے پانچویں باب میں ادارتی انتظامات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ پالیسی کو مستحکم اور مستقل بنیادوں پر چلانے کے لیے چند اداروں کے قیام کی تجویز دی گئی ہے اور پیداوار بڑھانے کے لیے مختلف سہولیات اور مددگار اداروں کی قومی، صوبائی اور ضلعی سطح پر قیام کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس عمل کو وزارت کی سطح سے نچلی سطح (یعنی دیہی آبادیوں) تک کرنے کی ضرورت ہے۔ تجویز دی گئی کہ محکمے اور وزارتیں ضرورت کے مطابق اپنے اندر تبدیلیاں لائیں۔ اشیاء پر تحقیق کو نظام کے حوالے سے دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے تاکہ کاشت کرنے والی آبادیوں کی آمدنی میں اضافہ اور تحقیق کے اثرات میں بہتری ہو۔

پیداوار کے بڑھاؤ اور تحفظ خوراک کے اہداف کے حصول کے لیے یہ پالیسی درج ذیل شعبوں کا احاطہ کرتی ہے:

(الف) تحفظ خوراک اور تحقیق اور ترقی (R&D) کے لیے پیداواری لاگت میں کمی تاکہ غذائیت سے بھرپور غذا اور فائبر کی پیداوار کی جاسکے۔

(ب) پائیدار توانائی اور خوراک کی پیداوار کے لیے زمین اور پانی کے نئے ذخائر کا استعمال۔

(ج) نیم شہری علاقوں میں صحت مند سبزیوں کی پیداوار میں فروغ۔

(د) پھل، سبزی اور دودھ کے لیے مشترکہ بنیادوں پر منڈی (cooperatives) کا قیام تاکہ پیداوار کرنے والوں کو مناسب آمدنی حاصل ہو، روزگار پیدا ہو سکے اور غذا کے حوالے سے مہنگائی کو روکا جاسکے۔

(ر) خوراک، فائبر، سبزیوں اور تیل کے بیج کی عمودی (vertical) پیداواری اضافہ کے لیے سرمایہ کاری۔

(ز) زرعی پولیٹیکنک اداروں کا قیام۔

(ژ) مختلف زرعی اشیاء کی قیمتوں، منڈی کی صورتحال اور تجزیہ کی گھنٹہ کی بنیاد پر اخبارات اور الیکٹرونک (ٹیلیوژن) میڈیا کے ذریعہ تشہیر۔

(س) چھوٹے اور وسائل کی کمی کے شکار کسانوں کو سستے اور موثر طریقہ کار کے تحت مسابقتی بنیادوں پر قرضوں کی فراہمی۔

بھوک اور خوراک میں کمی سے نمٹنے اور سہولیات اور مدد فراہم کرنے کے لیے اداروں کو مستحکم کرنا یا نئے اداروں کے قیام کی تجویز دی گئی ہے۔

مجوزہ پالیسی میں فوری طور پر چند ادارتی پیش رفت کرنے کی تجویز دی گئی ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

- وزیر اعظم کی سربراہی میں کونسل برائے خوراک اور غذائیت (Food and Nutrition Security Council) کا قیام اس پالیسی کو تعاون پیش کرے گی۔ وزارت برائے قومی تحفظ خوراک اور تحقیق (Ministry of National Food Security and Research) تمام قومی اور صوبائی متعلقہ وزارتیں، کمیشن اور پروگرام اس میں شامل ہوں گے۔
- پاکستان زیرو ہنگر پروگرام اور اس سے جڑے ہوئے لائحہ عمل کے ذریعہ کونسل برائے خوراک اور غذائیت کو مضبوط کرنا اور پہلے سے موجود اور نئے خوراک اور غذائیت پر مبنی پروجیکٹوں کے درمیان روابط پیدا کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔
- ایگریکلچر پالیسی انسٹی ٹیوٹ کو تحفظ خوراک پالیسی کی نگرانی کی اضافی ذمہ داری کے ساتھ مستحکم اور پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل سے منسلک کرنے کی رائے دی گئی ہے۔ اس پالیسی کے مخصوص مقاصد میں قومی تحفظ خوراک اور تحقیق کی وزارت، محکموں، ترقیاتی شراکت داروں، سول سوسائٹی اور نجی شعبوں سمیت وفاقی اور صوبائی حکام کو شامل کرنے کے عمل کو آسان بنانا ہے۔ اس کے علاوہ پروگراموں کو تیار کرنا اور تحفظ خوراک و غذائیت کی نگرانی کے لیے طریقہ کار وضح کرنا شامل ہے۔

تجزیہ

جس طرح پہلے بیان کیا گیا ہے کہ بظاہر اس پالیسی میں کئی مثبت تجاویز پیش کی گئی ہیں، مگر اس مسودہ کا اگر مجموعی احاطہ کیا جائے اور مرکزی نکتہ تلاش کیا جائے تو درج ذیل سنگین پہلو سامنے آتے ہیں۔

تحفظ خوراک بمقابلہ خوراک کی خود مختاری: اس مسودہ کو پڑھ کر بہت واضح ہے کہ حکومت پاکستان خوراک اور غذائیت کے سنگین مسئلہ سے نمٹنے کے لیے نام نہاد تحفظ خوراک کے نظریہ کو اپنا محور بنا رہی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلہ میں دنیا بھر کی کسان تنظیمیں اور کئی ممالک ''خوراک کی خود مختاری'' کے نظریہ کے تحت اپنے خوراک، غذائیت اور زراعت کے مسائل کو حل کرنے کی طرف سرگرداں ہیں۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان دونوں نظریوں میں کیا فرق ہے؟

تحفظ خوراک: تحفظ خوراک سے مراد ملک کے تمام افراد کے لیے غذا کی موجودگی ہے۔

غذائی موجودگی چاہے وہ مقامی طور پر پیداوار کے ذریعہ ہو یا پھر کسی اور ملک سے درآمد کے ذریعہ۔ تحفظ خوراک اس بات پر کوئی توجہ نہیں دیتی کہ خوراک کہاں سے اور کن حالات میں پیدا کی گئی ہے۔ تحفظ خوراک کھانے والوں کی ترجیح کو بھی یکسر نظر انداز کردیتی ہے کہ ایک خاص آبادی اپنے لیے کیا اور کس قسم کے خوراک کے استعمال کو پسند کرتی ہے۔ غرض یہ کہ غذائی تحفظ، تحفظ خوراک کا ایک مصنوعی طریقہ ہے جس میں صرف خوراک کی موجودگی اور رسائی کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور معاشرے میں طبقاتی ناہمواریوں کو یکسر نظر انداز کردیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظریہ تحفظ خوراک پائیدار پیداواری نظام کو بنیاد نہیں بناتا بلکہ غیر ملکی پیداوار پر انحصار کرتا ہے۔ معیاری غذا کے لیے بھی کیمیائی اشیاء مثلاً ڈی اے پی، یوریہ اور زہریلی اسپرے پر کوئی نکتہ نظر نہیں پیش کیا جارہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تحفظ خوراک کا نظریہ معیاری، صاف ستھری اور غذائیت والی غذا کو کلیدی اصول کی حیثیت نہیں دے رہا۔ یہی وجہ ہے کہ تحفظ خوراک کے نظریہ سے کسان اور عوام اختلاف رکھتے ہیں، یہ نظریہ بالادست طبقات اور عالمی استعمار کے مفاد کی نگہبانی کرتے ہوئے غیر ملکی زرعی کمپنیوں کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔

خوراک کی خود مختاری: خوراک کی خود مختاری غذا کی پیداوار، ترسیل اور استعمال کے دائرے کا احاطہ کرتی ہے۔ تحفظ خوراک کے برعکس خوراک کی خودمختاری غذا پیدا کرنے والی آبادیوں کو اپنے روزگار اور طرز زندگی پر مکمل اختیار دیتی ہے۔ یہ نظریہ زرعی پیداواری وسائل مثلاً زمین، بیج، پانی اور جنگلات وغیرہ پر اختیار اور رسائی مقامی آبادیوں کو دیتا ہے۔ یہ نظریہ نہ صرف غذا کی موجودگی اور رسائی کو یقینی بناتا ہے بلکہ مقامی آبادیوں کی ترجیحات کو اولین اہمیت دیتا ہے تاکہ وہ غذا کی اقسام اور طریقہ پیداوار کا فیصلہ خود کرسکیں۔ اس کے علاوہ خوراک کی خود مختاری طریقہ پیداوار اور غذائیت پر اہمیت دیتی ہے جس سے انسانی صحت اور زمین کی زرخیزی کو یقینی بناتے ہوئے ماحول کو آلودگی سے بچانے پر موثر اقدامات اٹھائے جاتے ہیں۔

پائیدار ترقی اور مجوزہ خوراک اور غذائیت کی پالیسی: جون 2012 میں اقوام متحدہ نے پائیدار ترقی کے حوالے سے ریوپلس 20 کے نام سے ایک عالمی اجلاس منعقد کیا، جس کے ذریعہ مستقبل کے لیے عالمی ترقی کے خدوخال کو واضح کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ پائیدار ترقی کی سوچ تیزی سے بگڑتی ہوئی موسمی اور ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ آج دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اس موسمی بگاڑ کی وجہ سے خوراک کے پیداور پر بھی بہت منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں اور نتیجہ میں بھوک میں اضافہ ہوا ہے۔

پیش کردہ خوراک اور غذائیت کی قومی پالیسی میں لفظ پائیدار ترقی کا استعمال تو ہے لیکن پائیدار زراعت کو جگہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ پاکستان کی سرکار نے ریوپلس 20 کانفرنس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور لفظ پائیدار ترقی سے بھی انکار نہیں کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں کئی غریب ممالک بشمول پاکستان کا بنیادی مطالبہ غربت کے خاتمے پر تھا۔ لہذا اب جب خوراک اور غذائیت کی یہ اہم ترین پالیسی بنائی جارہی ہے تو یہ امید کی جارہی تھی کہ اس میں غربت کے خاتمے کے لیے کوئی موثر لائحہ عمل کو جگہ دی جاتی۔ بھوک و افلاس کے خاتمے کو مساوات پر مبنی معاشرے کے قیام اور پائیدار ترقی کے حصول سے جوڑا جاتا۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ پائیدار ترقی کا نظریہ خود اب ابہام کی نظر ہوچکا ہے۔ اقوام متحدہ کا موجودہ پائیدار ترقی کا نظریہ دراصل عالمی ماحولیاتی بحران، جس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ ایندھن کے استعمال کے ذریعہ صنعت چلانے پر ہے (جس میں ڈیزل اور پیٹرول بھی شامل ہیں) کو تبدیل کرکے صاف اور دوبارہ پیدا کیے جانے والے ایندھن اور اس کی پیداوار کو فروغ دینے کے اردگرد ہے اور اس سے جڑے ہوئے دیگر شعبوں میں سرمایہ کاری اور تجارت کو فروغ دیتا ہے۔ شدید افسوس کا مقام ہے کہ ریوپلس 20 کے اجلاس نے ''گرین ایکانومی'' یعنی سبز معیشت میں سرمایہ داری کو فروغ دینے والی ٹیکنالوجیوں کی جگہ بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ پالیسی عمودی سبزیوں، دیگر عمودی پیداوار (یعنی ایسے پودوں کی پیداوار جو کہ کم سے کم زمین گھیرے) کو جگہ دے کر ہمیں سرمایہ دار ممالک سے لائی جانی والی ٹیکنالوجی پر محتاجی کی طرف دھکیلنے کی کوشش ہے۔ اس طرح کی پیداوار ایک بار پھر قدرتی پیداواری طریقوں سے بہت دور ہے۔ عمودی زرعی پیداوار زمین کی زرخیزی کی بنیاد پر غذائیت نہیں حاصل کرتی بلکہ مصنوعی نیوٹرینٹس پر انحصار کرتی ہے۔ اس سے کسان کی ناصرف روزی پر وار کیا گیا ہے بلکہ ہمارے ملک کے قیمتی زرمبادلہ کو بے دریغ بہانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ یہ سب ٹیکنالوجیاں ذہنی ملکیت کے معاہدوں کے تحت آئیں گی اور سرکار کو ان کی ذہنی ملکیت کی بھاری فیس ادا کرنا پڑے گی۔ یقیناً یہ سارے اقدامات ملک کو مزید قرض میں جکڑ لیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پالیسی کسان عوام دوست نہیں بلکہ سرمایہ دار اور جاگیردار کے تحفظ کے لیے بنائی گئی ہے۔

اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اگر خوراک کی پیداوار بڑھانا مقصود تھا تو زرعی زمین کے منصفانہ اور مساویانہ تقسیم کے لیے پالیسی سازی کرنی چاہیے تھی۔ یہ ایسی جامع پالیسی ہوتی جس سے ناصرف ایک بہت بڑی آبادی کا روزگار محفوظ ہوجاتا بلکہ پوری قوم کے لیے صاف ستھری غذا کی فراہمی بھی ممکن ہوجاتی کیونکہ اس طرح کی پالیسی سازی کے ساتھ ساتھ جڑی وہ ٹیکنیکی وتحقیقی تدابیر فروغ پاتیں جس سے کسان کیمیائی زہریلی پیداوار سے ہٹ کر قدرتی طریقہ زراعت کی طرف راغب ہوتے۔ ویسے بھی پاکستان کا چھوٹا کسان روایتی کھیتی باڑی کے طریقوں سے بخوبی واقف ہے اور اس طریقے کو فوراً فروغ حاصل ہوتا۔ اس میں ناصرف ہم موسمی بحران کے خلاف بہتر لائحہ عمل اپناتے بلکہ ملک کی ڈیزل اور تیل پر سے محتاجی کو بھی کم کر پاتے، لیکن عوام دوست پالیسی سازی کی جگہ منڈی کو جو کہ حالیہ بحران کی سب سے بڑی وجہ ہے، پھر سے ایک نئی ذمہ داری دے دی گئی۔ منڈی کے ذریعہ پائیدار ترقی کا حصول کبھی بھی ممکن نہیں۔

پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ (PBR): تحفظ خوراک اور غذائی پالیسی اس میں ایک اور انتہائی اہم پہلونظر انداز کردیا گیا ہے جس کا تعلق پیداوار کرنے والوں کے حقوق سے ہے جسے پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا ذکر اس پورے مسودہ میں نہیں کیا گیا ہے۔ PBR (پی بی آر) کا موجودہ مسودہ دراصل بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے۔ پی بی آر خاص طور پر جینیاتی بیجوں اور فصلوں کے حوالے سے انتہائی خطرناک ہے، کیونکہ اس سے کمپنیوں کے منافع میں تو اضافہ ہو جاتا ہے مگر مقامی کسان اپنی بیج اور روزگار سے محروم ہوجاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ تحفظ خوراک اور غذائیت کی اس پالیسی میں نشاندہی کی جاتی کہ کس طرح پی بی آر کا موجودہ مسودہ چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے لیے انتہائی نقصاندہ ہے کیونکہ اس کے ذریعے نئی اجناس اور پودوں کی پیداوار کا سارا اختیار بڑی بڑی زرعی کمپنیوں کو سونپا جارہا ہے۔ جب تک بیجوں کے مالک کسان خود نہیں ہوں گے، زراعت پر مکمل اختیار کسانوں کا نہیں ہوگا، جو کہ صدیوں سے کھیتی باڑی کرتے چلے آرہے ہیں تو غذائی خود کفالت کا حصول ناممکن ہے۔ بیج کی ملکیت کمپنیوں کی ہو اور تحفظ خوراک عوام کی، یہ دو متضاد باتیں ہیں۔ تحفظ خوراک اور غذائیت کی پالیسی بنانے والوں کو اس پہلو پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

کارپوریٹ طریقہ زراعت: پالیسی میں زراعت کو جدید خطوط سے ہم آہنگ کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس پالیسی کا یہی وہ نکتہ ہے جو کہ حکمراں طبقہ کی ترجیحات کا تعین کرتا تھا۔ جس ملک میں بے روزگاری انتہا تک ہو اور جہاں لوگوں کی قوت خرید کی سطح کم ہو، جہاں پیداواری لاگت انتہائی مہنگی ہونے کی وجہ سے چھوٹا اور بے زمین کسان و مزدور اس شعبہ سے روزگار حاصل نہ کرپارہا ہو، وہاں پیداوار بڑھانے کے لیے ''مختلف زرعی اشیاء کی قیمتوں، گھنٹے کی بنیاد پر منڈی کی صورت حال کی ٹیلی ویژن پر تشہیر'' جیسی تجویز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس پالیسی کا مرکز پاکستانی دیہی آبادیاں نہیں ہیں جو کہ صحیح معنوں میں کھیتی باڑی کے شعبے سے جڑی ہوئی ہیں بلکہ وہ کاروباری طبقہ ہے جو زراعت سے منافع درمنافع کمارہا ہے۔ اس حقیقت سے کسے آگاہی نہیں کہ ہماری دیہی آبادیوں کو بنیادی انسانی سہولیات مثلاً پانی، خوراک، تعلیم، صحت کی سہولیات پوری طرح میسر نہیں تو ان آبادیوں کے لیے گھنٹے کی بنیاد پر منڈی کی صورتحال پر معلومات کی تشہیر کیا معنی رکھتی ہے؟ اس قسم کی تشہیر تو صرف زراعت کے شعبے میں کاروبار کرنے والی بڑی بڑی زرعی غیر ملکی کمپنیوں کے لیے ہوسکتی ہے جو ان معلومات کی بروقت آگاہی کی بنیاد پر اپنے منافع کو کئی گنا بڑھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

یہ ایک بہتر امر ہے کہ پالیسی بنانے والوں کی توجہ مائیکرو نیوٹرینٹ کی جانب انتہائی گہری ہے کیونکہ عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ مائیکرو نیوٹرینٹ (نامیاتی مرکبات) کی بجائے میکرو (Macro) نیوٹرینٹ مثلاً سلفر، نائیٹریٹ اور فاسفورس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت ہے کہ جب تک زمین کو مائیکرو اور میکرو نیوٹرینٹ کی متوازن مقدار نہیں ملے گی خوراک کی غذائیت ممکن نہیں۔ نامیاتی مرکبات میں کمی کی نشاندہی تو کی گئی ہے مگر ہماری زمینوں میں نامیاتی مرکبات میں کمی کیوں ہوئی اس کا کوئی ذکر نہیں۔ جب تک ہم مسائل کا صحیح احاطہ نہیں کریں گے اس کا صحیح تدارک بھی ممکن نہیں۔ زرعی ماہرین کے مطابق نامیاتی مرکبات میں کمی بڑے پیمانے پر ایک جیسی فصلوں (mono croping) کو اگانے کی وجہ سے ہوئی ہے اور دوسری بڑی وجہ کیمیائی کھاد اور کیڑے مار ادویات کا استعمال بھی ہے۔[2] زمین میں نامیاتی مرکبات میں کمی کو دور کرنے کا قدرتی طریقہ یہ ہے کہ پائیدار طریقہ زراعت کو اپناتے ہوئے مختلف قسم کی فصلوں کو اگایا جائے۔ اس کے علاوہ کیمیائی کھاد اور کیڑے مار ادویات کے استعمال کو مکمل طور پر رد کیے بغیر نامیاتی مرکبات میں کمی کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ اس پالیسی میں مائیکرو نیوٹرینٹ پر بہت زیادہ زور اس وجہ سے دیا جارہا ہے کہ کمپنیوں کی تیار کردہ مائیکرو نیوٹرینٹ کے فروغ میں آسانی کی جاسکے اور اس طرح ایک نئی منڈی سرمایہ داری کے منافع کمانے کے لیے کھول دی جائے۔[3]

پالیسی میں بیان کیے گئے مسائل یا رکاوٹوں کا بغور تجزیہ کیا جائے تو بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر چھوٹے چھوٹے رقبہ پر زیادہ تر کاشتکاری کرنے کو بھی ایک رکاوٹ یا مسئلہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جس ملک کی دیہی آبادی کا 98 فیصد چھوٹے اور بے زمین کسانوں پر مشتمل ہو، اس ملک کی سرکاری دستاویز میں ملک کی کثیر آبادی کو اس طرح نیچے دکھانا حیرت انگیز ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ شدید لمحہ فکریہ کا حامل بھی ہے۔ حکومت شاید اب ان چھوٹے چھوٹے رقبہ والوں سے زمین لے کر کارپوریٹ فارمنگ کو فروغ دینے کے لیے غیر ملکی سرمایہ کار کمپنیوں یا پھر بڑے جاگیرداروں کو دینے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ زمین کی ملکیت کے بغیر غذائی خود کفالت کا خیال ہی انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ بجائے اس کے کہ بڑی بڑی جاگیریں، جاگیرداروں سے لے کر بے زمین کسانوں رہاریوں و مزدوروں میں منصفانہ اور مساویانہ بنیادوں پر تقسیم کی تجویز دی جاتی، پالیسی میں چھوٹے رقبے پر کاشت کاری کو رکاوٹ کے طور پر پیش کیا گیا۔

مجموعی طور پر اس پالیسی میں خوراک کی دستیابی پر بہت زور دیا گیا ہے جو کہ ایک اچھی بات ہے۔ مگر خوراک کی دستیابی جن طریقوں سے یقینی بنانے کی کوشش کی گئی ہے وہ انتہائی تشویش ناک ہیں۔ خوراک کی دستیابی کا پہلا طریقہ تو مقامی پیداواری طبقوں کے لیے پیداواری وسائل پر اختیار اور ان کے لیے سہولیات کی فراہمی کا ہونا چاہیے تھا۔ اس کی تقسیم کو بہتر بنانے کا نہیں۔ جن طریقوں سے پیداوار بڑھانے کی تجویز پیش کی گئی ہے اس سے آنے والے دنوں میں غذائی عدم تحفظ کم ہونے کی بجائے بڑھے گا۔ زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانے والے بیج، کیمیائی کھاد، کیڑے مار ادویات کے استعمال سے نہ صرف زمین کی زرخیزی ختم ہورہی ہے بلکہ ہماری خوراک بھی زہر آلود ہورہی ہے۔ پیداوار بڑھانے کی یہ تجاویز دراصل غیر ملکی کمپنیوں کے منافع میں مزید اضافہ کا باعث بنے گی اور ہماری عوام خاص کر کے دیہی آبادی مزید بھوک و بے روزگاری کا شکار ہوگی۔

خوراک کی دستیابی کا ایک اور طریقہ جو اس پالیسی مسودہ میں بڑھا چڑھا کر

پیش کیا گیا ہے وہ خوراک کی درآمدات ہے۔ پاکستان جیسے زرعی ملک جس کی نصف سے زیادہ آبادی دیہی ہو غیر ملکی خوراک پر انحصار کرے، ہماری خود انحصاری کے خاتمے کے ساتھ ملک کے لاکھوں کسان مزدوروں کی بے روزگاری کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ یہ درآمدات ملکی زرمبادلے پر مزید دباؤ ڈال کر ہمیں بیرونی قرض کے جال سے باہر نہیں نکلنے دیں گی۔

گوکہ اس پالیسی میں ذکر نہیں ہے پچھلے سال 2012 میں امریکی صدر اوبامہ نے جی-8 کے کیمپ ڈیوس سمٹ کے موقع پر ''تحفظ غذا اور غذائیت پر نئے اتحاد'' (The New Alliance for Food Security and Nutrition) کا اعلان کیا۔ اس نئے اتحاد میں تحفظ خوراک حاصل کرنے میں زرعی نجی کمپنیوں کا کلیدی کردار بتایا جارہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بڑی بڑی بین الاقوامی زرعی کمپنیاں تحفظ غذا اور غذائیت کو اپنا مقصد بنا رہی ہیں اور غذا کی فراہمی منافع کی بنیاد پر ہونے والی ہے تو یہ واضح طور پر عوامی گروہوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ عالمی کمیٹی برائے تحفظ خوراک (Committee on World Food Security) نے لفظ تحفظ خوراک کو غذائیت سے جوڑ دیا ہے۔ اب ان دونوں کو ملا کر زرعی پیداواری پالیسیوں کو خوراک کی خود مختاری سے بالکل علیحدہ کردیا گیا ہے۔ یہ نئی اصطلاح زرعی پالیسی کے مسودوں میں نظر آرہی ہے اور نظریہ یقیناً عوام کے لیے غذا نہیں ہے بلکہ نجی شعبہ کے منافع کمانے اور بڑھانے کے لیے ہتھکنڈے ہیں۔

پاکستانی عوام خاص کر کے کسان گروہوں کو تحفظ خوراک اور غذائیت پر ہونے والی پالیسی سازی میں بھرپور طور پر اپنی آواز شامل کرکے نہ صرف اس اصطلاح کو رد کرنا چاہیے بلکہ خوراک کی خود مختاری کو تمام زرعی پالیسیوں کے لیے مرکزی کردار منوانا چاہیے۔

حوالہ جات

1۔ نیشنل فوڈ اینڈ نیوٹریشن سیکورٹی پالیسی (ڈرافٹ)، نیشنل فوڈ سیکورٹی اینڈ ریسرچ ڈویژن، منسٹری آف نیشنل فوڈ سیکورٹی اینڈ ریسرچ، 2012، اسلام آباد۔

2. World Resources Institute. "*World resources 1998-99: environmental change and human health.*" World Resources Institute, the United Nations Development Programme, and the World Bank. May, 1998, accessed from http://www.wri.org/publication/world-resources-1998-99-environmental-change-and-human-health.

3۔ زرعی ماہر فلیڈی ریویریا سے غیر رسمی بات چیت، 5 اپریل، 2012۔

پاکستان مسلم لیگ (ن) کا انتخابی منشور 2013[1]

روٹس فار ایکوٹی

ملک میں انتخابات 2013 کے سلسلے میں پرزور سیاسی سرگرمی نظر آتی رہی ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی دیگر سیاسی جماعتوں کو اپنا سیاسی نظریہ و ایجنڈا پیش کرنا تھا۔ ان میں پاکستان مسلم لیگ (ن) نے بھی اپنا مینی فیسٹو 2013: نیشنل ایجنڈا فور ریل چینج (حقیقی تبدیلی کے لیے قومی ایجنڈا) پیش کیا۔ گوکہ انتخابی منشور میں کئی اہم نکات ہیں لیکن یہاں پر صرف زرعی اور دیہی ترقی کے حوالے سے خلاصہ اور مختصر تبصرہ پیش کیا جائے گا۔

انتخابی منشور کا تیسرا باب ''زراعت اور تحفظ خوراک'' کے نام سے پیش کیا گیا ہے اور اس کے تین حصے ہیں۔ (1) ماحولیاتی تحفظ (2) تحفظ خوراک اور (3) سماجی تحفظ۔ تمہید میں بیان کیا گیا ہے کہ زراعت ملک کے جی ڈی پی کا 21 فیصد حصہ ہوتے ہوئے معیشت کا سب سے بڑا شعبہ ہے اور ملک کے آدھے سے زیادہ مزدور طبقے کے لیے روزگار مہیا کرتا ہے۔ برآمدات سے حاصل کی گئی آمدنی کا 70 فیصد حصہ زراعت اور زرعی مصنوعات فراہم کرتی ہیں۔ زراعت کئی طرح کی صنعت کو خام مال مہیا کرتا ہے اور صنعتی پیداوار کا 40 فیصد حصہ استعمال کرتا ہے۔ منشور کے مطابق زرعی شعبہ میں بڑھوتری کا تناسب 1980 کے دہائی میں 5.4 فیصد تھا جو 2000 کی دہائی میں گر کر 3.4 فیصد رہ گیا جس کی بنیادی وجہ برآمدات اور درآمدات کی مالیت میں منفی تناسب تھا۔ انتخابی منشور میں زرعی ترقی کو بڑھانے اور غربت کم کرنے کے لیے دیے گئے نکات میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

- زراعت کو ایک مکمل معاشی صنعت بنانے کے لیے پالیسی ڈھانچہ میں زرعی برآمدات اور درآمدات کی مالیت میں مثبت تناسب کے لیے تبدیلی کی جائے گی۔
- چھوٹے کسان کو زرعی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھتے ہوئے ان کی رسائی علم/معلومات، زرعی پیداواری اشیاء اور منڈیوں تک یقینی بنائی جائے گی۔
- مال مویشی کے شعبہ کی ترقی کے لیے خاص توجہ اور ماہی گیری اور باغ بانی سے حاصل ہونے والی فصلوں کو خاص مراعات دی جائیں گی۔
- کارپوریٹ زراعت کو نئی توانائی دی جائے گی تاکہ جو مجبوریاں کم رقبہ زمین کے مالکان کو درپیش ہیں ان کو عبور کیا جاسکے۔ اس کے لیے زمینی ترقی کے لیے کارپوریشنز بنائی جائیں گی جن میں غریبوں کا زیادہ حصہ ہوگا۔ ان کارپوریشنوں کا انتظام پیشہ ورانہ (professionals) طبقے کے پاس ہوگا۔
- زرعی قرضہ نظام کی اصلاح تاکہ تمام قرضوں کا 50 فیصد چھوٹے کسانوں کو دیا جاسکے۔ مائیکرو کریڈیٹ پروگراموں کے لیے عورتوں کو خاص ترجیح دی جائے گی۔
- غذائی اور مہنگی فصلوں کے حوالے سے پاکستان کی بطور بڑے برآمدی ملک میں تبدیلی۔ فصلوں کی ذخیرہ اندوزی اور مارکیٹنگ کے جدید انتظام کیے جائیں گے۔

- تحقیقی اداروں کو دوبارہ سے بنایا جائے تا کہ پیداواری صلاحیت کو مستقل بنیادوں پر بڑھایا جاسکے اور تحقیق کے فوائد کسانوں تک پہنچ سکیں۔
- زرعی تعلیم کو جدید بنایا جائے گا۔
- پی ایم ایل (ن) کے زمینی اصلاحات کے پروگرام کے تحت مزید زمین پر اختیار حاصل کیا جائے گا تا کہ بے زمین عورتوں اور ہاریوں کو زمین بانٹی جاسکے۔

تحفظ ماحولیات

ماحولیات کے حوالے سے مستحکم ترقیاتی پالیسیاں کو خاص ترجیح دی جائے گی تا کہ ملک کے جنگلات اور قدرتی وسائل کو سنبھالا اور گلوبل وارمنگ کے اثرات سے نمٹا جاسکے۔

تحفظ خوراک

تحفظ خوراک کا مسئلہ غربت سے جڑا ہوا ہے اس لیے غربت میں شدید کمی پی ایم ایل (ن) کے لیے سب سے اہم ترقیاتی حوالے سے چیلنج ہے۔

''خوراک پر حق'' آئین میں نئے آرٹیکل کے لیے پارلیمانی اجازت کی کوشش اور خوراک پر حق کے اطلاق کے لیے صوبائی حکومت کے ساتھ مشاورت کی بنیاد پر اگلے 10 سال میں اوسطاً چار فیصد سالانہ زرعی بڑھوتری حاصل کی جائے گی۔ مشاورت کی بنیاد پر خوراک کی خریداری اور ترسیل کا نظام مقرر کیا جائے گا۔ غریب گھرانوں کی قوت خرید کے مطابق خوراک کی قیمت کا تعین اور بہت غریب گھرانوں کے لیے حفاظتی اقدام کے شفاف نظام کا انتظام کیا جائے گا۔

ترقیاتی پالیسیوں میں تھوڑی بہت تبدیلی سے بڑے پیمانے پر غربت کے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ ایک بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے جس کے تحت بڑھوتری کے لیے لائحہ عمل غریبوں کے حق میں ہو۔ ان کو پیداواری وسائل مثلاً زمین، مال مویشی اور تعلیم و ہنر حاصل کرنے کے لیے سہولیات تک بہتر رسائی دی جائے گی۔ کھیتی باڑی سے ہٹ کر دیہی علاقوں میں چھوٹے اور درمیانے درجہ کے کاروبار کے تحت روزگار فراہم کیا جائے گا اور غذا کے قیمتوں میں ٹھہراؤ لایا جائے گا۔

معاشرتی تحفظ

معاشرتی تحفظ کے تحت ایک مربوط منصوبہ پیش کیا جائے گا تا کہ غریب گھرانوں کو مہنگائی اور قدرتی آفات سے محفوظ رکھا جاسکے۔ اس پروگرام کے کچھ نکات یہ ہیں:

- سب کی قوت خرید کے مطابق غذائی اناج کی قیمتیں کم کی جائیں گی۔
- کسانوں کے لیے اناج پر امدادی قیمت دی جائے گی۔
- ضرورت مند گھرانوں کے لیے شفاف انکم سپورٹ پروگرام متعارف کروایا جائے گا۔ جس کی خاص توجہ بیواؤں، یتیموں اور بچیوں پر ہوگی۔ صوبوں کے ساتھ مل کر پی ایم ایل (ن) 2018 تک موجودہ معاشرتی تحفظ کے حوالے سے جی ڈی پی کے ایک فیصد اخراجات کو بڑھا کر کم از کم دو فیصد کردے گی۔

مختصر تبصرہ

پی ایم ایل (ن) کا مینی فیسٹو زرعی لائحہ عمل کے حوالے سے چھوٹے اور بے زمین کسان کے لیے شدید لمحہ فکریہ لیے ہوئے ہے۔ جیسا کہ مینی فیسٹو خود نشاندہی کرتا ہے کہ زراعت اور دیہی آبادیاں پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ لیکن اس شعبہ سے جڑی ہوئی کثیر آبادی کے معاشی اور معاشرتی استحکام کے لیے کوئی مربوط لائحہ عمل نہیں پیش کیا گیا۔ سب سے اہم پالیسی یقیناً منصفانہ اور مساویانہ زمینی اصلاحات ہیں۔ گو کہ مینی فیسٹو پارٹی کے زمینی اصلاحات کے پروگرام کا ذکر کرتا ہے لیکن کوئی خاطر خواہ تفصیل تو نہیں بیان کی گئی مگر یہ ذکر کردیا گیا کہ چھوٹے رقبے کے مالکان کی جو ''مجبوریاں'' ہیں وہ کارپوریٹ زراعت کے ذریعہ حل کی جاسکتی ہیں۔ پاکستان کسان مزدور تحریک کے مطابق کسانوں کی ''مجبوریوں'' کا واحد حل منصفانہ اور مساویانہ زمینی بٹوارے میں ہی ہے[2] لیکن اس تدبیر کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کارپوریٹ زراعت کو مسیحا کے طور پر پیش کردیا گیا۔

پی ایم ایل (ن) کا مکمل رجحان جدید زراعت اور زرعی سرمایہ داری کو فروغ دینے پر نظر آتا ہے۔ زیادہ پیداوار، مارکیٹنگ اور برآمدات اس مینی فیسٹو کے بنیادی نکات ہیں۔ ان سب کا دارومدار آخر میں کیمیائی زرعی طریقہ پیداوار پر ہے۔ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ جدید زراعت ایک طرف ماحولیاتی آلودگی اور بحران کی ضامن ہے اور دوسری طرف چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو قرض کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ بڑھے گا لیکن سرمایہ کس کا بڑھے گا؟ منافع کون حاصل کرے گا؟ یقیناً غیر ملکی سرمایہ کار اور پاکستانی تاجر جدید زراعت سے بہت کچھ حاصل کرلیں گے لیکن غریب دیہی آبادیاں مزید پسیں گی۔

اسی حوالے سے مائیکرو کریڈیٹ کا ذکر تشویشناک ہے۔ قرض اور سود کی ادائیگی ہماری حکومتوں کو تباہ کرچکی ہے۔ اب یہ سلسلہ منافع خور بینکوں اور لیزنگ کمپنیوں کے ذریعہ غریب بستیوں تک بھی پہنچایا جارہا ہے۔ نا کہ مینی فیسٹو ایسے عوامل کی حوصلہ افزائی کرتا کہ آبادیاں خوراک کی خود مختاری کی طرف جاتیں یہاں محتاجی بڑھانے کی تمام تر کاوشیں نظر آرہی ہیں۔

منشور سیاسی جماعتوں کے وعدوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ پی ایم ایل (ن) کے انتخابات میں جیتنے کے بہت امکانات ہیں۔ کسان گروہوں کے لیے اشد ضروری ہے کہ وہ چوکنا ہوجائیں تا کہ جدید زراعت کو فروغ دینا تقریباً ہر بڑی سیاسی جماعت کا نصب العین ہے۔ اگر چھوٹے و بے زمین کسانوں کا منشور خوراک کی خود مختاری ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم آنے والی حکومت کو اپنا نظریہ بتاتے ہوئے اپنے لیے بہتر حکمت عملی کے ساتھ منظم ہوجائیں

حوالہ جات:

1. PMLN Manifesto English, accessed from PML-N
ww w.pmln.org/pmln-manifesto-english/pa. Posted on April 18, 2013.

2۔ پاکستان کسان مزدور تحریک اور رولس فار اکیوٹی۔ ''قومی اور صوبائی مشاورت برائے زمینی اصلاحات''۔ رولس فار اکیوٹی اور پاکستان کسان مزدور تحریک، 2012۔

بائیو فیولز کے لیے عالمی دباؤ کی وجہ سے بھوک میں مبتلا*

(گواتے مالا شہر)

تحریر: ایلیز بتھ روزین تھل ترجمہ: روٹس فار ا کیوٹی

لاطینی امریکہ کے ایک ملک گواتے مالا میں زمینداروں کا غذائی فصلوں کی طرف سے رجحان ہٹنے سے گواتے مالا کی عوام پر اثرات

ٹورٹیلاز (مکئی کے آٹے کی روٹی) بیچنے والی دکانوں کے باہر لوگ ان کے بڑھتے ہوئے داموں پر سخت شکایت کرتے ہوئے پائے جائیں گے۔ صرف تین سال پہلے تقریباً 13 سینٹس (11 روپے) کے آٹھ ٹورٹیلاز مل جاتے تھے۔ آج صرف چار ملتے ہیں جبکہ انڈوں کی قیمت بھی تین گنا زیادہ ہوگئی ہے کیونکہ مرغیاں مکئی سے بنی ہوئی غذا (کورن فیڈ) کھاتی ہیں۔

گواتے مالا کے دیہی علاقوں میں چھوٹے بے زمین کسان اپنے بیج بونے کے لیے زمین کی تلاش میں مشکلات کا سامنا کررہے ہیں۔ ایک کسان ہوزے انٹونیو الواراڈو (Jose Antonio Alvarado) ایک ہائی وے کے بیچ میں چھوٹی سی پٹی پر اپنی مکئی کی فصل کی کٹائی کررہا تھا جہاں سے تیز رفتار ٹرکیں بار بار گزر رہی تھیں۔ اس کسان کے مطابق ''ہم یہاں پر کھیتی باڑی کررہے ہیں کیونکہ اور کہیں پر زمین نہیں ہے اور مجھ کو اپنے خاندان کے لیے خوراک مہیا کرنی ہے''۔ اس کے ساتھ اس کے دو بیٹے آلی ہندرو (Alejandro) اور ہوزے (Jose) تھے جن کی عمر چار اور چھ سال تھی لیکن دیکھنے میں یہ بچے اپنی عمر سے چھوٹے لگ رہے تھے جو کے کم غذا کے شکار ہونے کی نشانی ہے۔

امریکہ اور یورپ میں حالیہ قانون سازی جس کے تحت زیادہ سے زیادہ پیمانے پر گاڑیوں کو بائیو فیول پر چلانے کا حکم دیا گیا ہے کا دور دور تک اثر پڑا ہے۔ ماہر معاشیات کا کہنا ہے کہ جو زمین پہلے انسانوں کے لیے غذا اگانے کے لیے تھی اب کبھی کبھی زیادہ منافع کو مدنظر رکھتے ہوئے گاڑیوں کے لیے تیل مہیا کرنے والی فصلوں کے لیے استعمال کی جارہی ہے۔ عالمگیریت کے تحت چلنے والی دنیا میں بائیو فیول صنعت کے پھیلنے سے غذا کی قیمتوں میں اضافہ اور افریقہ، ایشیاء اور لاطینی امریکہ میں غذا کی پیداوار کے لیے زمین میں کمی واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ خام مال وہاں اگایا جاتا ہے جہاں پر سب سے سستی پیداوار ہوسکے۔

امریکہ کی ریاست (صوبے) میساچوسیٹس (Massachusetts) میں پائی جانے والی ٹفٹس یونیورسٹی (Tufts University) کے ڈیولپمنٹ (ترقی) پر ماہر ٹیموتھی وائز (Timothy Wise) جو کہ ایکشن ایڈ کے ساتھ مل کر اس مسئلے کا عالمی بنیاد پر تجزیہ کررہے ہیں کا کہنا ہے کہ شاید یہ دباؤ اور کہیں اتنا واضح نہیں جتنا گواتے مالا میں کیونکہ ''یہ ملک بحیرا اوقیانوس کے دونوں طرف سے مارا جارہا ہے'' (یعنی اس لاطینی امریکی ملک کے ایک طرف امریکہ ہے اور دوسری طرف یورپ)۔ دوسرے لفظوں میں فصلوں سے تیل بنانے سے گواتے مالا کے کھیتوں پر بھی اثر ہے اور اس کی منڈیوں پر بھی۔

وسطی امریکہ کی بنیادی غذا مکئی ہے اور کیونکہ یہ خطہ امریکہ سے جغرافیائی حوالے سے بہت قریب ہے اس لیے جب امریکہ کی مکئی پالیسی میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو یہ علاقہ ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اب جبکہ امریکہ مکئی کی پیداوار کا 40 فیصد حصہ بائیو فیول بنانے پر لگا رہا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ گواتے مالا میں ٹورٹیلا کی قیمتیں دوگنی ہوگئی ہیں کیونکہ گواتے مالا تقریباً آدھی مکئی درآمد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، گواتے مالا کی زرخیز زمین جس کا زیادہ حصہ کچھ ہی خاندانوں کی جائیداد ہے بائیو فیول کے لیے خام مال اگانے کے لیے بہترین ہے۔ گواتے مالا کا ایک صوبہ سچی ٹیپکوئیز (Suchitepequez) جو کہ پانچ سال پہلے بڑے پیمانے پر مکئی کی پیداوار کرتا تھا اب گنے اور افریقی پام کی کاشت سے لب ریز ہے۔ جو زمین ایلوارڈو اپنے لیے مکئی کی کاشت کے لیے ٹھیکے پر لیا کرتے تھے اب اس پر ایک کمپنی بائیو ایتھنول یورپ برآمد کرنے کے لیے گنا اگاتی ہے۔

کاتھیا وینکلر (Katja Winkler) جو کہ دیہی مسائل پر تجزیہ کرنے والی گواتے مالن این جی او آئیڈیر (Idear) میں تحقیق کرتی ہیں کہ مطابق: ''ایک ایسے ملک میں جہاں زیادہ تر خاندان اپنی آمدنی کا دو تہائی حصہ خوراک پر خرچ کرتے ہیں وہاں اب ایک عام گواتا مالن زیادہ بھوک کا شکار ہے کیونکہ بائیو فیول کی پیداوار کی جارہی ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق اس ملک کے 50 فیصد بچے مستقل پیمانے پر کم غذا کی شکار ہیں جو کہ عالمی شرح کے حوالے سے چوتھے نمبر پر ہے۔

امریکہ کی دوبارہ پیدا ہونے والی توانائی کے لیے قائم کیے گئے معیار کا تقاضا ہے کہ امریکی گاڑیوں کے لیے تیل میں بائیو فیول کی تعداد کو ہر سال بڑھایا جائے تاکہ ایندھن (fossil fuels) سے نکلنے والے کاربن اخراج کو کم کیا جائے اور ساتھ ساتھ امریکی تحفظ توانائی کو سہارا دیا جائے۔ اسی طرح یورپ میں بھی 2020 تک ذرائع نقل وحمل (ٹرانسپورٹ) میں استعمال ہونے والے تیل میں بائیو فیول کی تعداد کم از کم 10 فیصد ہونی چاہیے۔ بڑی کمپنیاں جیسے کہ پین ٹیلیون شوگر (Pantaleon Sugar) جو کہ گواتے مالا میں شکر کی پیداوار کرنے والی سب سے بڑی کمپنی ہے اس نئے مطالبہ سے منافع کما رہی ہے۔ انٹر امریکن ڈیولپمنٹ بینک کا کہنا ہے کہ اگر اس صنعت کو صحیح طریقہ سے پروان چڑھایا گیا تو یہ گواتے مالا کی دیہی معیشت کے لیے نقد اور روزگار مہیا کرے گی۔ ابھی شکر کی صنعت 60,000 اور پام کی صنعت 17,000

مزدوروں کے لیے روزگار مہیا کرتی ہے حالانکہ دونوں پلانٹیشنز یعنی کاروباری کھیت لیبر انٹینسیو (labor intensive) نہیں ہیں دوسرے لفظوں میں ان کھیتوں میں زیادہ کام مزدوروں سے نہیں کروایا جاتا بلکہ مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اب یہ فکر بڑھ رہی ہے کہ گواتے مالا کا غریب غذائی فصل کی تیل کی فصل میں تبدیلی سے پسنا شروع ہو چکا ہے۔ گواتے مالا کے کسانوں کی ایک لیبر یونین سی یو سی کے ایک اہل کار میسائل گونزالز (Misael Gonzales) کا خیال ہے کہ ''بائیو فیول کے حوالے سے منفی اور مثبت باتیں ہیں لیکن یہاں نہیں۔ یہاں لوگوں کے پاس کھانے کو پورا نہیں ہے۔ ان کو خوراک کی ضرورت ہے۔ ان کو زمین کی ضرورت ہے۔ یہ بائیو فیول کھا نہیں سکتے اور ان کے پاس گاڑیاں چلانے کو نہیں ہیں''۔

بروس اے بیکوک (Bruce A. Babcock) جو کہ امریکہ کی آئی اووا سٹیٹ یونیورسٹی (Iowa State University) میں ماہر زرعی معاشیات ہیں کا کہنا ہے کہ 2011 میں مکئی کے دام 17 فیصد کم ہوتے اگر امریکہ اپنی رینیوبل فیول پالیسیز (دوبارہ پیدا ہونے والے تیل کے لیے پالیسیز) کے تحت بائیو فیول کی پیداوار کے لیے مراعات نہیں فراہم کرتا۔ ورلڈ بینک نے کہا ہے کہ ترقی پزیر دنیا میں غذا کی فراہمی کم ہونے یا پھر غذا کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہونے کی حالت میں بائیو فیول کے لیے دیے گئے احکامات میں ترمیم کرنی چاہیے۔ اسی حوالے سے یورپی کمیشن کو بھی فکر لاحق ہوئی ہے کہ اس کے بائیو فیول کے حوالے سے دیے گئے احکامات کا عالمی بھوک پر کیا اثر پڑے گا۔ اس لیے اس ادارے نے یہ رائے دی ہے کہ وہ اپنی (بائیو فیول) پالیسی میں ایسی ترمیم کرے کہ اس کے تحت 2020 کے لیے جو اہداف مقرر کیے گئے تھے ان میں سے صرف آدھے پورے کیے جائیں گے اگر بائیو فیول غذائی اجناس سے تیار کردہ ہو یا پھر ایسی زمین پر اگایا گیا ہو جہاں پہلے غذائی فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ (بائیو فیول کے حوالے سے) امریکی احکامات جو کہ کانگریس نے 2007 میں طے کیے تھے اینوائرمینٹل پروٹیکشن ایجنسی کے ذریعہ ختم کیے جاسکتے ہیں لیکن اس ایجنسی کے مطابق قانون کے تحت احکامات میں ترمیم اس وقت کی جاسکتی ہے کہ جب مسائل مقامی حوالے سے نظر آئیں یعنی ایسا کوئی مسئلہ کہ جس میں بائیو فیول کی ضرورت کو پورا کرنے سے کسی (امریکی) صوبے یا علاقہ کی معیشت پر بہت برا اثر پڑا ہو۔

ایک وقت تھا کہ گواتے مالا مکئی کی پیداوار میں تقریباً خود کفیل تھا۔ لیکن 1990 کی دہائی میں اس ملک کی مکئی کی درآمد پر محتاجی بڑھ گئی کہ جب امریکہ میں مراعات یافتہ ضرورت سے زیادہ مکئی کی پیداوار نے جنوب (یعنی لاطینی امریکہ) کا رخ کیا۔ وائز صاحب کا کہنا ہے کہ ''گواتے مالا کے کسان ان مراعات کا مقابلہ نہ کر پائے اور مکئی کی پیداوار 1995 سے 2005 کے دورانیہ میں فی کس 30 فیصد کم ہوگئی''۔ جب امریکہ نے (اپنی بائیو فیول پر بنائی پالیسی) 2007 بائیو فیول سٹینڈرڈ کو مکئی کے ذریعہ پورا کرنا شروع کردیا تو سستی درآمدات غائب ہوگئیں۔ گواتے مالا میں موجود اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام کے سربراہ گائے گوورا (Guy Gauvreau) کا کہنا ہے کہ ''مکئی کو بائیو فیول کی پیداوار میں استعمال کرنے کی وجہ سے یہ پاگل دام دیکھنے میں آرہے ہیں، یہ اخلاقیات کے حوالے سے بالکل ناقابل قبول ہیں''۔

مقامی صنعت ایسوسی ایشن گرے پاما (Grepalma) کی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر سوزانہ سیکاوزا (Susana Siekavizza) کا کہنا ہے کہ گواتے مالا سے پام آئل کو کھانے کے لیے برآمد کیا جاتا ہے لیکن اس کے بڑھتے ہوئے دام اس کی عالمی مانگ کی نشاندہی کرتے ہیں کیونکہ یہ ایسی فصل ہے جو بائیو فیول بنانے کے لیے بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہ ایسے خام مال کی شکل میں برآمد کی جاتی ہے کہ جس کو بعد میں مقطر (distil) کرکے بائیو فیول میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ گنے کی فصل جو کہ گواتے مالا کی فصلوں میں ایک بڑی فصل تھی کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا ہے کیونکہ اس کے لیے بائیو فیول نے نئی منڈیوں میں داخل ہونے کی جگہ فراہم کی ہے۔ پینٹالی اون شوگر (Pantaleon Sugar) جو کہ پہلے صرف غذائی فصلوں کو برآمد کرتا تھا اب اپنی پیداوار کی 13 فیصد کو تیل کے لیے استعمال کررہا ہے۔ شکر کی مقامی قیمتیں دوگنی ہوگئی ہیں۔ گواتے مالا کے بڑے بڑے زمینداروں کے لیے یہ زیادہ آسان اور زیادہ منافع بخش بھی ہے کہ بائیو فیول کی بڑی کمپنیوں کو لمبے معیاد کے لیے زمین ٹھیکے پر دے دیں بنسبت اس کے کہ وہ زمین کو مال مویشی پالنے (cattle farming) کے لیے استعمال کریں یا چھوٹے کسانوں کو ٹھیکے پر دیں۔ تجارتی گروہ کی سوزانہ سیکاوزا صاحبہ کا کہنا تھا کہ پام کی پیداوار لوگوں سے خوراک چھین رہی ہے زیادہ کہانی ہے اور کم حقیقت کیونکہ گواتے مالا کا زیادہ رقبہ اور مٹی کی بناوٹ ''مکئی اگانے کے لیے مفید نہیں''۔

ملک کی شمالی علاقوں کے دور دراز مایَن (Mayan) گاؤں میں کاروباری کھیت (پلانٹیشنز) گھس آئے ہیں لیکن کچھ ہی لوگوں کو اچھی نوکریاں اور تربیت حاصل ہوئی ہے۔ زیادہ شکایتیں کم تنخواہ اور کمر توڑنے والے کام کی سننے میں آتی ہیں۔ زیادہ کام افریقی پام کے درختوں پر چھوٹے چھوٹے لال رنگ کے پھل کو توڑنا ہے یا پھر جو زمین پر گرے ہوئے ہیں ان کو اٹھانا ہے۔ ال کین سیلرو (El Cancellero) کے ایک گاؤں میں جوانہ پولا ٹیک چوک (Juana Paula Tec Choc) کا کہنا تھا کہ ''ہم نے اپنی زمین فروخت کردی اور اب ہم کو کام کرنا پڑ رہا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بہتر ہے ہم اپنا خود اگائیں۔ کم از کم آپ کے پاس کچھ تحفظ تو ہوتا ہے''۔

حوالہ جات

* Rosenthal, Elisabeth. "*Hunger pains from global push for biofuels.*" International Herald Tribune, Monday, January 7, 2013, p.6.

بات تو سچ ہے مگر

یو ایس ایڈ کی بجلی گھر کے لیے مالی امداد

واپڈا کے چیئرمین راحت شاہ اور یو ایس ایڈ (USAID) کے ڈائریکٹر جوناتھن کونلے (Jonathan Conly) نے جمعہ کے روز پالن اور پن بجلی گھر کے منصوبوں کے حوالے سے مالی امداد پر تبادلہ خیال کیا۔ امریکہ واپڈا کو مالی مدد فراہم کرنے والے چند بڑے ملکوں میں سے ایک ہے۔ گزشتہ چار سالوں میں یو ایس ایڈ تربیلا، منگلا ڈیموں میں آلات کو جدید طرز پر استوار کرنے کے لیے، ڈیموں کی تکمیل اور گومال زم اور ست پارہ ڈیموں کی نہری اسکیموں کے لیے 300 ملین ڈالر کی رقم فراہم کرچکا ہے۔ یہ سرمایہ کاری بجلی کی پیداوار میں اضافے، 200,000 ایکڑ زیر کاشت رقبہ کو سیراب کرنے کے لیے پانی کی فراہمی اور پاکستان میں سیلاب کی روک تھام کے لیے کی گئی ہے۔

اس موقع پر بات کرتے ہوئے واپڈا کے چیئرمین نے کہا کہ پاکستان 10,000 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کے لیے اربوں ڈالر کی ضرورت ہے۔

(دی نیوز، 5 جنوری، 2013)

اقوام متحدہ کا پانی کے تحفظ کو اجاگر کرنے پر زور

عالمی طور پر موسم اور پانی کے حوالے سے بدلتے ہوئے رجحانات کے پیش نظر آنے والے دنوں میں مزید بڑی موسمیاتی تبدیلیوں کی پیشن گوئی کی گئی ہے۔ اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ پانی کے مسئلے کو اپنے ایجنڈا میں شامل کرے۔

پائیدار ترقی کے مقاصد میں سے ایک ''عالمی سطح پر پانی کے تحفظ'' کو اپنانے کے لیے بین الاقوامی سطح پر حمایت بڑھ رہی ہے۔ تاہم ''پانی کے تحفظ'' کی تعریف کی عدم موجودگی کی وجہ سے بین الاقوامی فورمز پر پیش رفت کمزور رہی ہے۔ پانی کے عالمی دن کے موقع پر آج اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر، نیو یارک میں ''پانی کے تحفظ'' کی ایک مشترکہ تعریف شائع کی گئی ہے جسے اقوام متحدہ نے پیش کیا جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

''کسی آبادی کا پائیدار روزگار، انسانی فلاح و بہبود اور سماجی و معاشی معیار کے مطابق پانی تک پائیدار رسائی کی صلاحیت تاکہ پانی سے پھیلنے والی آلودگی اور پانی کے حوالے سے آفات کے خلاف تحفظ کو یقینی بنایا جائے اور قدرتی نظام کو پرامن اور سیاسی استحکام کے ماحول میں تحفظ دیا جاسکے''۔

(دی نیوز، 23 مارچ، 2013)

اقوم متحدہ پانی کے مسئلہ پر انتہائی سنجیدہ ہوتے ہوئے اس کے حل کے لیے سفارشات و تجاویز مرتب کرتا نظر آتا ہے اور ''پانی کے تحفظ'' کی حالیہ مرتب کردہ تعریف اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر پانی کے تحفظ کی تعریف کو بغور سمجھیں تو اقوام متحدہ نے بڑی خوبصورتی سے وہی سطحی تعریف مرتب کی ہے جو کہ ہمیشہ اس کا شیوہ رہا ہے۔ مثلاً آبادیوں کے پائیدار روزگار اور فلاح و بہبود کے لیے ضرورت کے مطابق پانی تک پائیدار رسائی کا لفظ استعمال کیا گیا۔ پانی جو کہ ایک انتہائی اہم انسانی ضرورت ہے کو بنیادی انسانی حقوق میں شامل کیا جانا تھا۔ اقوام متحدہ کو چاہیے تھا کہ وہ آبادیوں کا پانی پر حق کو تسلیم کرتا اور تعریف کو صرف رسائی تک محدود نہ رکھتا بلکہ پانی پر آبادیوں کے اختیار کو یقینی قرار دیا جاتا۔ مگر کیا کیجیے کہ دیگر شعبوں کی طرح اقوام متحدہ یہاں بھی پانی کا کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے لیے مواقع فراہم کرنا نہ بھولا۔

اب اگر اوپر دی گئی دونوں خبروں کا تجزیہ کریں تو ایک طرف اقوام متحدہ پانی کے پائیدار حل کی طرف پیش رفت کی بات کرتا ہے۔ جبکہ امریکہ اور اس کا ادارہ یو ایس ایڈ دنیا بھر میں پانی کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے پانی کے بڑے بڑے زخائز یعنی ڈیمز کی تعمیر کے لیے خطیر رقوم فراہم کرتا رہا ہے۔ ڈیمز پر کام کرنے والے عوامی ماہرین کا کہنا ہے کہ بڑے ڈیم کی تعمیر ماحول اور انسانی آبادیوں کے لیے انتہائی غیر ترقی پسندانہ سرمایہ کاری ہے۔ اس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر نقل مکانی اور آبادیوں کا روزگار محدود ہونے کے علاوہ ماحولیاتی نظام میں بڑے پیمانے پر توڑ پھوڑ ہوتی ہے۔

اقوام متحدہ کی طرف سے پائیدار روزگار کے لیے راہیں ہموار کرنے کی بات اور امریکہ اور دیگر مالیاتی اداروں کی طرف سے ایسے منصوبوں کے لیے مالی مدد جس سے آبادیوں کا روزگار یکسر ختم ہوجاتا ہے کھلا تضاد ہے جس کو ابھارنے کی ضرورت ہے۔ ڈیموں کی تعمیری منصوبوں سے عالمی ادارے اور مقامی اشرافیہ اپنا مالی مفاد حاصل کرتے ہیں۔ نتیجہ میں جب ملک بڑے بڑے قرضوں کے بوجھ تلے دب جاتا ہے تو انہی آبادیوں پر مختلف معاشی اصلاحات کے ذریعہ استحصال کا ذریعہ بننے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔

گندم کی پیداوار بڑھانے کے لیے پاکستانی اور امریکی سائنسدانوں کا اشتراک

امریکی سائنسدان اور پاکستانی ماہرین کے درمیان گندم کی پیداوار بڑھانے اور ملکی سطح پر کسانوں کے خوشحالی کے لیے اشتراک جاری ہے۔ ریڈیو پاکستان کے مطابق امریکی محکمہ زراعت (USDA) کے تعاون سے دونوں ملکوں کی مشترکہ ٹیم بیماریوں کے خلاف مزاحمت کرنے والی گندم کی بیج کی اقسام کی جانچ پڑتال کررہی ہیں۔ پاکستان کے

مخصوص ماحولیاتی حالات میں کون سی قسم گندم کی بہتر نتائج دیتی ہے، اس کے لیے امریکی اور پاکستانی محققین نے مختلف تجربات کیے مثلاً پاکستان میں کاشت ہونے والی مختلف گندم کی بیج کی قسموں پر گرمی اور مختلف قسم کی ماحولیاتی دباؤ کے اثرات کا جائزہ لیا۔

USDA (یو ایس ڈی اے) اپنے گندم کی پیداوار بڑھانے کے منصوبے (Wheat Productivity Enhancement Project/WPEP) کے ذریعہ پورے پاکستان میں 115 نمائشی کھیتوں پر گندم کی 60 مختلف قسموں کے تجزیے میں مدد فراہم کررہا ہے۔ اس مشترکہ تحقیق کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے گزشتہ ہفتہ یو ایس ڈی اے نے پاکستانی تحقیقی اداروں کو گندم بونے اور کٹائی کے لیے جدید آلات فراہم کیے۔ یہ نئے آلات جو کہ گزشتہ 25 سالوں سے استعمال ہونے والے آلات کے نعم البدل ہیں، سائنس دانوں کو ہر سال گندم کی نئی قسموں کی تحقیق اور پاکستانی کسانوں کی پیداوار میں تیز رفتار اضافے کا باعث بنیں گے۔ یو ایس ڈی اے کے پودوں کی صحت پر اعلیٰ تجاویز پیش کرنے والے افسر آئن وین بورن نے نئے آلات کی تقسیم کے تقریب کے موقع پر کہا کہ ''گندم پاکستان اور امریکہ دونوں کی تحفظ خوراک کے لیے انتہائی ضروری ہے''۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''پاکستان اور امریکی سائنسدانوں کے درمیان طویل المدتی روابط دونوں ملکوں کی زرعی پیداوار کو بہتر بنانے اور بچانے کے لیے موثر ثابت ہوگی''۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 3 مارچ، 2013)

نیسلے کی پاکستان میں سرمایہ کاری

شیخوپورہ میں واقع نیسلے کی دودھ سکھانے والی سہولت کے پراجیکٹ کا افتتاح نیسلے کے ایگزیکٹیو آفیسر اور عالمی آپریشن کے انچارج ہوزے لوپیز (Jose Lopez) نے کیا۔ صارفین کے لیے مصنوعات پیدا کرنے والی اس دیوہیکل کمپنی نے صارفین کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے مختلف توسیعی منصوبوں میں گزشتہ دو سالوں کے دوران 148 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے۔ نامہ نگار سے بات کرتے ہوئے ہوزے لوپیز نے کہا کہ کمپنی اس سال 60-50 ملین ڈالر سرمایہ کاری کا ارادہ رکھتی ہے۔ پاکستان میں سرمایہ کاری کے حوالے سے کیے گئے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ کمپنی کسی ملک میں سرمایہ کاری ''جتنا بڑا کاروبار اتنی بچت'' (economies of scales) یا سستے مزدور کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لیے نہیں کرتی۔

''ہم کوئی وینچر کیپیٹل فنڈ نہیں کہ ہمیں کسی ملک کی رسک پروفائل یعنی اس ملک میں سرمایہ کاری کے حوالے سے خطرات یا اندیشوں کی فکر ہو۔ ہماری سرمایہ کاری کے فیصلے امن و امان کی صورتحال یا توانائی کی کمی یا زرمبادلہ کی شرح میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے متاثر نہیں ہوتے۔ نیسلے جس ملک میں موجود ہوتا ہے وہاں پر طویل مدت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کرتا ہے''۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں یقین ہے کہ طویل مدتی کامیابی کے لیے ہمیں اپنے شیئر ہولڈر (حصص) کے ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرے کے لیے قدر (value) پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم جس ملک میں سرمایہ کاری کرتے ہیں اس ملک سے اور ہمارے صارفین سے وابستگی ہوتی ہے۔ ان کے مطابق پاکستان نیسلے کے لیے ایک بڑھتی ہوئی منڈی ہے اور یہاں کے صارفین کے بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو وقف کررہے ہیں۔

نیسلے پاکستان کی پچھلی سال 22 فیصد بڑھوتری ہوئی جبکہ اس کا سالانہ ٹرن اوور (turnover) تقریباً 79 بلین روپے رہا۔ ٹرن اوور سے مراد پورے سال میں کمپنی کی اشیاء کی فروخت کی مالیت ہے۔

(ڈان، 23 مارچ، 2013)

آئی فاڈ (IFAD) بلوچستان کے لیے 30 ملین ڈالر کا منصوبہ

زرعی ترقی کے بین الاقوامی بینک (International Fund for Agricultural Development/IFAD) اور پاکستان نے ماہیگیروں کے بہتر روزگار کے حصول کے منصوبے کے لیے آئی فاڈ کے روم میں موجود ہیڈ کوارٹر میں 30 ملین ڈالر کے ایک قرضے پر دستخط کیے ہیں۔ گوادر اور لسبیلہ کے اضلاع پاکستان کی ساحلی علاقوں کی مجموعی حصے کا تین چوتھائی ہیں۔ یہ اضلاع وفاقی دارالحکومت سے بہت دور اور ملک کے باقی حصوں سے غیر منسلک ہیں۔ اس علاقہ میں ترقی اور بہتری کی بہت ضرورت ہے۔

حالیہ تکمیل شدہ کوسٹل ہائی وے پوری ساحلی پٹی کو کراچی اور نئے گوادر پورٹ سے منسلک کرکے ماہیگیروں کی مصنوعات کی درآمد سمیت علاقائی اور عالمی تجارت کو بڑھانے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ آئی فاڈ کے ملکی پروگرام منیجر کے مطابق اس پروجیکٹ کا مقصد یہاں کے لوگوں کو منڈی سے منسلک کرکے ان کی آمدنی اور روزگار میں اضافہ ہے۔ یہ پروجیکٹ 382 گاؤں میں غریب گھرانوں کے لیے ہے جن میں چھوٹے اور بے زمین کسان، چھوٹے ماہی گیر اور دیہی عورتیں شامل ہیں۔ اس پروجیکٹ کے ذریعہ تقریباً 20,000 دیہی گھرانے مستفید ہوں گے۔

(ڈان، 2 فروری، 2013)

زیادہ کیڑے مار ادویات کی وجہ سے رعشے (کپکپاہٹ) کی بیماری

کھیتوں میں ضرورت سے زیادہ کیڑے مار اور جڑی بوٹی صاف کرنے والے ادویات کے استعمال سے رعشے کی بیماری (Parkinson's Disease) کا تعلق دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ ایک ایسی ذہنی بیماری ہے جس میں مریض کپکپاہٹ اور سستی کے ساتھ اپنی جسمانی چال ڈھال کھودیتا ہے۔ پاکستان میں تقریباً پانچ لاکھ افراد اس بیماری کا شکار ہیں لیکن ان میں سے اکثر کو ضروری صحت کی معلومات نہ ہونے کی سبب اس کا علم ہی نہیں۔ یہ مشاہدہ جمعرات کو اس بیماری کے عالمی دن کے موقع پر ایک سیمینار میں معروف ذہنی امراض کے ماہرین اور صحت عامہ کے ماہرین کے ذریعہ سامنے آیا۔

ماہرین کے مطابق گو کہ رعشے کی بیماری مریض کو کمزور اور نحیف کر دیتی ہے اس کا علاج موجود ہے جس کے ذریعہ اس کے علامات کو کم کیا جاسکتا ہے تا کہ اس مرض کے شکار افراد عام زندگی گزار سکیں۔

ذہنی امراض کے ڈاکٹر مغیض شیرانی کے مطابق اس بیماری کا تعلق کھیتوں میں ضرورت سے زیادہ کیڑے مار ادویات اور جڑی بوٹی تلف کرنے والی ادویات سے ہے۔ ''گو کہ یہ ہماری اپنی تحقیق نہیں ہے مگر یہ ایک عالمی تسلیم شدہ حقیقت ہے''۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ بیماری مرکزی اعصابی نظام کے عدم توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ زراعت میں استعمال ہونے والی کیڑے مار ادویات انسانی جسم میں داخل ہو کر ذہنی عدم توازن پیدا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے دنیا بھر میں اورگینک فوڈ (organic food) پر زور دیا جارہا ہے جو کہ کسی بھی طرح کے کیمیائی ادویات اور کھاد کے بغیر ہوتے ہیں۔

دی نیوز، 12 اپریل، 2013

سماجی شعبہ میں پاکستان کے سب سے کم اخراجات: یو این ڈی پی

اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (یو این ڈی پی) کی جاری کردہ ''انسانی ترقی رپورٹ 2013'' کے مطابق پاکستان کا شمار سماجی شعبہ میں سب سے کم خرچ کرنے والے ملکوں میں کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ملک کی سیاست پر 100 خاندان کی اجارہ داری ہے جو کہ حالیہ تحلیل شدہ صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ممبران کی صورت میں تھی۔ انسانی ترقی کے انڈکس (Human Development Index/HDI) میں پاکستان کی درجہ بندی 2013 میں گر کر 146 ویں پوزیشن پر پہنچ چکی ہے۔

''جنوب کا عروج: تنوع دنیا میں انسانی ترقی'' (The Rise of South: Human Progress in a Diverse World) کے عنوان سے اس رپورٹ کے مطابق پاکستان میں عورتیں اور غریب اور متوسط آمدنی والے افراد زیادہ تر انتخابی اخراجات اور عورتوں کے لیے سماجی و ثقافتی رکاوٹوں کی وجہ سے ایوان تک رسائی سے قاصر ہیں۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ 2010-2000 کی دہائی میں آمدنی کے فرق میں 0.27 سے 0.29 (Gini Coefficent) اضافہ ہوا ہے۔ تاہم علاقائی، سماجی نتائج اور پیداواری اثاثوں تک رسائی میں عدم مساوات، آمدنی کے فرق سے بھی زیادہ واضح ہے۔ مثال کے طور پر بلوچستان کے 44 فیصد اور خیبر پختون خواہ کے 52 فیصد پرائمری اسکولوں میں اندراج کے مقابلے میں پنجاب میں اندراج 61 فیصد تک ہے۔ مجموعی طور پر سات ملین بچے اسکول نہیں جارہے جن میں 60 فیصد لڑکیاں شامل ہیں۔ بچوں کی اموات کی شرح بلوچستان میں ہر 1000 میں سے 104 اور پنجاب میں 82 جبکہ خیبر پختونخواہ میں 76 ہے۔ اس کے علاوہ 2010 میں اعداد و شمار کے حوالے سے پوری آبادی کے 20 فیصد سب سے امیر آبادی میں بچے اوسطاً 8.95 سال تک تعلیم حاصل کرتے ہیں جبکہ 20 فیصد سب سے غریب آبادی میں بچوں کے اسکول جانے کے اوسط سال 2.41 ہے۔

وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور رسائی کی وجہ سے پاکستان میں پہلے ہی سماجی تنازعات اور کشیدگی میں اضافہ ہورہا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ مسائل مزید بڑھیں ان کو فوری طور پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ بنگلہ دیش اور ہندوستان صحت پر اپنی جی ڈی پی (GDP) کا 1.2 فیصد خرچ کرتے ہیں اور تعلیم پر بنگلہ دیش 2.2 فیصد اور ہندوستان 3.1 فیصد خرچ کرتا ہے جبکہ پاکستان اپنی جی ڈی پی کا 0.8 فیصد صحت اور 1.8 فیصد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ برازیل انسانی ترقی کے حوالے سے سرفہرست ہے جو اپنی جی ڈی پی کا صحت پر 4.25 اور تعلیم پر 5.7 فیصد خرچ کرتا ہے۔

دی نیوز، 29 مارچ، 2013

اوپر دی گئی چار خبروں کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک طرف بیرونی سرمایہ کاری اور ترقیاتی منصوبوں کے لیے خطیر رقم خرچ کی جارہی ہے مگر دوسری طرف اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ اس بات کا انکشاف کرتا دیکھائی دیتا ہے کہ پاکستان میں سماجی شعبوں میں سب سے کم اخراجات کیے جاتے ہیں جبکہ نتیجہ میں طبقاتی فرق بڑھتا جارہا ہے۔ ملک میں ایک خاص طبقہ ہے جو کہ ملک کی زیادہ تر وسائل پر قابض ہے کیونکہ پاکستانی ایوان تک اسی خاص طبقہ کی رسائی ممکن ہے۔

آج جب رعشے کی بیماری کا تعلق کیمیائی کھاد اور کیڑے مار ادویات کے استعمال سے ثابت ہوا تو اورگینک فارمنگ کے فروغ کی بات ہونے لگی۔ خود ہی پیداوار (منافع) بڑھانے کے لیے ہائی بریڈ بیجوں کو مارکیٹ میں لے کر آئے اور اس کے ساتھ ڈی اے پی، یوریا اور اسپرے بھی۔ پھر چند دہائیوں کے بعد اورگینک فارمنگ کی صلاح بڑے پیمانے پر دی جارہی ہے جس کے ذریعے بڑی بڑی زرعی کمپنیاں مزید منافع کمانے کے راستے نکال چکی ہیں۔

گوادر کی ساحلی پٹی پر IFAD یا نیسلے کے خشک دودھ کے حوالے سے سرمایہ کاری تمام کی تمام بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے منافع میں مزید اضافہ اور ایسی 100 خاندان جن کا اقوام متحدہ کے مطابق پاکستان میں قبضہ ہے کے وسائل میں مزید اضافے اور ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہے۔ وسائل پر بیرونی اور اندرونی طاقتوں کا قبضہ اور عوام کا سیاسی و معاشی فیصلہ سازی تک عدم رسائی ہی بلوچستان اور ملک کے دیگر حصوں میں پائے جانے والی ناچاقی اور غم وغصہ کی نشاندہی کرتا ہے۔

بیرونی سرمایہ کاری اور منصوبوں پر عوام کو سخت نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں نا صرف مقامی مزدوروں اور کسانوں کے روزگار پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ ملک کے اثاثوں کو باہر منتقل کرتے ہوئے غربت اور ناانصافی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر ملکی خود مختاری اور سلامتی پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔